BIHAR URDU ACADEMY

اکتوبر ۲۰۲۴ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

جنمے جے مترا رماںؔ

غزل

اس پری کی جو مقرر ہوں میں دربانی پر
پاؤں رکھوں نہ کبھی تخت سلیمانی پر

دست قدرت کا لکھا ہے یہی پیشانی پر
خط سبق لے گیا اس کا خط ریحانی پر

نہ ہوا موم دل اس رشک پری کا نہ ہوا
لاکھ افسوں پڑھا سنگ سلیمانی پر

ان سے ظالم کے اٹھائے ہیں سدا جور فلک
کیا ڈراتا ہے مجھے اپنی ستم رانی پر

جانب غیر اگر تم نے ہلائی ابرو
ہم بھی رکھ دیں گے گلا تیغ صفاہانی پر

جنمے جے مترا رماںؔ ایک قدیم کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جوقنوج سے آ کر بنگال میں آباد ہوا تھا۔ارماںؔ کے خاندانی مورث اعلیٰ کا نام کالی داس متر تھا جن کی چوبیسویں پشت میں وہ آتے ہیں۔ارماںؔ کی تاریخ ولادت ۵/اکتوبر ۱۷۹۶ء اور جائے پیدائش خاندانی حویلی واقع مچھوا بازار کلکتہ ہے۔ان کے والد کا نام برندا بن چندر متر تھا اور ارماںؔ کے دادا پتا مبر مترا اپنے وقت کے بہت پڑھے لکھے، متمول اور قابل آدمی تھے جنہیں شاہ عالم بادشاہ نے ''راجہ بہادر'' کا خطاب دیا تھا۔انہیں سنسکرت اور بنگلہ کے علاوہ عربی و فارسی پر بھی کامل عبور تھا۔ارماںؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے دادا کی نگرانی میں ہوئی تھی۔وہ زبردست ذہانت وصلاحیت کے مالک تھے اور سنسکرت اور فارسی کے علاوہ بنگلہ، اردو اور برج بھاشا جیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔برج بھاشا میں وہ ''سنسکرسن داس'' کے قلمی نام سے شاعری کرتے تھے۔ان کے شعری مجموعے بنگلہ اور سنسکرت زبانوں میں بھی ہیں۔اردو شاعری میں ارماںؔ کو مشہور استاد سخن حافظ اکرام احمد ضیغمؔ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔انہوں نے اردو میں شاعری کی، ان کے دیوان کا تذکرہ بھی ملتا ہے، مگر وہ دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکا۔ارماںؔ کی اصلی شناخت ان کی تذکرہ نگاری سے ہے۔ارماںؔ کا ''منتخب التذکرہ'' جس کی ترتیب ۱۸۵۰ء میں ہوئی تھی، اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔اس میں تین سو سے زیادہ اردو شاعروں کے مختصر احوال واشعار درج ہیں، جب کہ تذکرہ ''نسخہ دلکشا'' جس کی ترتیب ۱۸۵۲ء میں ہوئی، آٹھ سو سے زیادہ شاعروں کے احوال اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر رئیس انور کے مقدمہ اور تصحیح متن کے ساتھ ارماںؔ کے تذکرہ ''نسخہ دلکشا'' کی اشاعت ۱۹۷۹ء میں اور ''منتخب التذکرہ'' کی اشاعت ۱۹۸۹ء میں ہو چکی ہے۔ارماںؔ کا انتقال پندرہ سال صاحب فراش رہنے کے بعد ۲۵ اگست ۱۸۶۹ء کو شیورا (مشرق کلکتہ) میں ہوا۔ارماںؔ کے بارے میں ڈاکٹر رئیس انور نے لکھا ہے کہ ''غالباً وہ واحد بنگالی ہندو ہیں جنہوں نے اردو میں شاعری کرنے کے ساتھ ہی ساتھ تذکرہ نگاری کے ذریعہ تاریخ ادب کا اولین نقش اور بنیادی ماخذ پیش کرنے کی کوشش کی۔

(تصویر ماخوذ بشکریہ ''نسخہ دلکشا'' مئی ۱۹۷۹ء)

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۱۰

اکتوبر ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.in

email : zabanoadabbua@gmail.com

buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

فہرست

اداریہ	حرف آغاز	ابرار احمد خان	۳
یادیں	کہکشاں پروین: یادیں اور افسانہ......	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۴
	ظفر اوگانوی: یادیں اور باتیں	نثار احمد صدیقی	۱۲
	مظفر حنفی کی کہانی میری زبانی	انجینئر فیروز مظفر	۱۷
	پروفیسر احمد حسن دانش: ایک استاد اور......	محمد جمال الدین اطہر	۲۳
مقالات	راشد انور راشد بحیثیت خاکہ نگار	ڈاکٹر محمد قیام نیّر	۲۶
	ناصؔر کاظمی کی شاعرانہ عظمت	ڈاکٹر یاسمین اختر	۲۹
	امین اعجاؔز کی نعتیہ شاعری	تنویر رضا برکاتی	۳۲
	فن تاریخ گوئی کی اہمیت وافادیت	سید محمد علی رضوی	۳۴
افسانے	جینے کی راہ	مالتی جوشی / اختر کاظمی	۳۶
	جرم کی چنگاری	ڈاکٹر شاہد فروغی	۴۰
	بلا قیمت	تنویر اختر رومانی	۴۴
	اللہ کی لاٹھی	ڈاکٹر قیصر زاہدی	۴۶
انشائیہ	کاٹ کھانا	ایس معشوق احمد	۴۸
منظومات	نعت پاک	رابعہ نورؔی / محمد علؔی رضا	۵۰
	یہ جہاں محو یاس ہے لوگو!	غلام صمدانی ندیؔم جعفری	۵۱
	میں نئی صدی کا جوان ہوں	منوؔر دانا پوری	۵۲
	غزلیں	مرغوب اثؔر فاطمی	۵۳
	غزلیں	احمد کمالؔ حشمی	۵۴
	غزلیں	م۔سروؔر پنڈولوی / خطاب عالم شاؔذ	۵۵
	غزلیں	ڈاکٹر فرحت حسین خوشدؔل / مسلم نوؔاز	۵۶
	غزلیں	رونؔق خلیقی / انجینئر وسیؔم اورنگ آبادی	۵۷
	غزلیں	راحتؔ حسن	۵۸
	غزل	محمد مکرم حسین ندوی خادؔم	۵۹
کتابوں کی دنیا	التفات واعتراف — ڈاکٹر اوویناش امن	مبصر : پروفیسر آفتاب اشرف	۶۰
	تاثرات — انوار الحسن وسطوی	مبصر : ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ	۶۲
	آئینہ در آئینہ — بشؔر رحیمی	مبصر : ثناء اللہ ثنؔا دوگھروی	۶۵
سلام و پیام	عبدالرزاق پیکر رضوی، ڈاکٹر شائستہ خاتون، کاظم رضا، محمد میکائیل تابشؔ قاسمی، ایم ارفاق، ڈاکٹر قیصر زاہدی، محمد بلال الدین، محمد منظر عالم، مدثر عمؔر کیفی، شاہد فروغؔی		۶۸

بچوں کا زبان وادب

۷۳ — ۸۰

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ادارية

حرف آغاز

سپاس بیکراں مالک لوح وقلم کا ــــــ ''یادیں'' سے مشمولاتی آغاز کے ساتھ ''زبان وادب'' کا تازہ شمارہ آپ کی نذر ہو رہا ہے، جس میں مذکورہ حصہ کے تحت ایک طرف ادبی ملاقات و مراسم اور چند سوانحی اشاروں کے ساتھ کہکشاں پروین کی ادبی خدمات، ان کی تصانیف اور ان کے عمدہ اخلاق و اطوار کا تذکرہ کرتے ہوئے، ان کی کہانی ''تواپر کی عورت'' کا مبسوط فنی تجزیہ سپرد قلم کیا گیا ہے اور ''ظفر اوگانوی: یادیں اور باتیں'' میں ان سے پہلی بار ملاقات کے مجلسی احوال بتاتے ہوئے ضمنی طور سے بعض نگارشات پر اظہار خیال بھی ہوا ہے اور پھر دوسری طرف ''مظفر حنفی کی کہانی میری زبانی'' کے عنوان سے ان کی سوانح اور ان کی ہمہ جہت علمی و ادبی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک استاد اور سماجی خدمتگار کی حیثیت سے پروفیسر احمد حسن دانشؔ کی زندگی، ان کے علمی شغف خصوصاً اُن کی شاعری اور ان کی سماجی فعالیت کے متنوع پہلو سامنے لائے گئے ہیں۔ اکتوبر کا مہینہ ادب وشاعری اور دیگر صیغہ ہائے حیات کی کئی معروف زمانہ ہستیوں کے اس دنیا میں آنے اور یہاں سے رخصت ہونے کا مہینہ ہے، اس مناسبت سے ''یادیں'' کے حصہ میں ایسی شخصیات کا بھی چندسطری ذکر شامل ہوا ہے جن پر وقتاً فوقتاً ڈاک ٹکٹ جاری ہوتے رہے ہیں۔

متذکرہ حصہ کے بعد ''مقالات'' کے تحت جہاں فنی مزیات دکھاتے ہوئے راشد انور راشد کو بحیثیت خاکہ نگار پیش کیا گیا ہے اور سوانحی کوائف کے ساتھ ''ناصؔر کاظمی کی شاعرانہ عظمت'' پر باتیں ہوئی ہیں، وہیں مناسب تمہید اور احوال حیات کے ساتھ ''امین اعجاز کی نعتیہ شاعری'' کے خصائص بتائے گئے ہیں اور ''فن تاریخ گوئی کی اہمیت وافادیت'' پر حسب موضوع مفید مطلب علمی نکات مبرہن کئے گئے ہیں۔

اس شمارے کے ''افسانے'' کی شروعات ''جینے کی راہ'' بتانے والی اُس مترجمہ نفسیاتی کہانی سے ہو رہی ہے جو عمدہ بنت اور دلوں کو چھو لینے والے مناظر کے ساتھ ایک غریب لڑکے اور اپنا بیٹا کھو دینے والے ایک غم زدہ جوڑے کے اردگرد گھومتی ہے۔ اس میں اُس بچے کا عزم بلند اور اُس جوڑے، خصوصاً اس عورت کا جذبہ ترحم ہی دیدنی نہیں بلکہ وہ پہلو بھی نہایت اہم ہے جو حزینہ فکر کے بدلنے کا موجب اور غم کی یادوں سے نکلنے کے منصوبہ کا محرک بنتا ہے۔ اسی طرح جہاں سماج دشمن عناصر کے ماحول و کردار سے جڑی کہانی میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ''جرم کی چنگاری'' کس طرح سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتی ہے وہیں موثر کلائمکس کی حامل کہانی ''بلا قیمت'' میں ساگر کے فیصلہ کا پیغام اور بھولا جیسے لالچی کردار سے جڑی کہانی ''اللہ کی لاٹھی'' میں بری سوچ کا برا انجام بھی چھپا نہیں رہ سکتا۔

ہمیں پوری امید ہے کہ اس شمارے میں ''یادیں'' بھی متوجہ کر دیں گی اور مقالوں اور افسانوں کے ساتھ ساتھ انشائیہ ''کاٹ کھانا'' بھی طنز ومزاح اور گلگشت خیالی کے وصف سے اپنی طرف بلائے گا۔ مزید برآں شعری وتبصراتی حصے بھی پسند آئیں گے اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی اُن کے درمیان مقبولیت پائے گا۔ زیادہ خدا حافظ، خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

یادیں

پروفیسر اسلم جمشید پوری

HOD, Urdu, CCS University,Meerut (Mob.09456259850)

کہکشاں پروین: یادیں اور افسانہ ''تواپر کی عورت'' کا تجزیہ

جھارکھنڈ ریاست کا قیام ۲۰۰۰ء میں عمل میں آیا۔ اس سے قبل یہ خطہ بھی بہار ہی کا حصہ تھا۔ جھارکھنڈ کے قیام سے بہت قبل ہی جن لوگوں کی شہرت بطور افسانہ نگار مستحکم ہو چلی تھی، ایسے فن کاروں میں ایک مستند نام کہکشاں پروین کا ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کہکشاں پروین قومی سطح کی ایک انوکھی افسانہ نگار تھیں۔ ان کے افسانے مثبت تانیثیت کی عمدہ مثال ہیں۔

کہکشاں پروین صاحبہ سے میری پہلی بھرپور ملاقات رانچی یونیورسٹی کے رفریشر کورس میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل ہلکی پھلکی ملاقاتیں تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے واقف تھے اور بطور افسانہ نگار بھی ایک دوسرے کو جانتے تھے، لیکن ریفریشر کورس میں جب میں نے انہیں طلبہ کے ساتھ صف اول میں دیکھا تو مجھے حیرانی بھری خوشی ہوئی تھی۔ یہ شاید ۲۰۱۲ء کی بات ہے۔ رفریشر کورس کے کوآرڈینٹر ڈاکٹر منظر حسین تھے۔ انہیں کے بلاوے پر میں رانچی رفریشر کورس میں کلاس لینے گیا تھا۔ کلاس میں سرور ساجد، انور ایرج وغیرہ بھی تھے۔ یہ سبھی میرے دوست تھے۔ ایسے میں کلاس کیا ہوتی، بس آپسی گفتگو ہو رہی تھی۔ سوال و جواب ہوتے رہے، پھر کہکشاں پروین نے میرا مشہور افسانہ ''لینڈرا'' میری زبانی سننے کی فرمائش کی۔ میرے پاس افسانہ ''لینڈرا'' کا مسودہ موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر کہکشاں پروین نے وہ بھی مہیا کرایا۔

میں نے اپنی آواز میں کلاس میں افسانہ سنایا۔ سب دم بخود سنتے رہے۔ افسانے کے اختتام پر افسانے سے متعلق سوالات کے جواب دیے۔ سوال کرنے والوں میں ڈاکٹر کہکشاں پروین بھی شامل تھیں۔ اس ملاقات کے بعد میرے دل میں ان کا احترام اور بڑھ گیا۔ اس رشتے کو مضبوطی دیتے ہوئے ڈاکٹر کہکشاں پروین نے میرے افسانوی مجموعے ''عید گاہ سے واپسی'' پر ایم فل کرایا۔ ایم فل کا یہ کام ان کی ریسرچ اسکالر آرزو خان نے کیا۔ یہی نہیں، انہوں نے افسانہ ''لینڈرا'' پر ایک مضمون لکھا اور اپنی کتاب ''شیشۂ افکار'' میں شامل کیا۔ کئی بار رانچی میں سمیناروں اور اجرا کے پروگرام میں اچھی ملاقات رہی۔

میں جب کبھی رانچی آتا تو ان سے ضرور ملتا۔ مل نہیں پاتا تو فون پر بات کر لیتا۔ کوئی تنقیدی کتاب آتی تو وہ مجھ سے مشورہ کر لیتیں۔ ان کا جب آخری افسانوی مجموعہ ''مور کے پاؤں'' آنے والا تھا تو انہوں نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ آپ کا افسانوی مجموعہ انتہائی دیدہ زیب شائع ہوگا، پھر میں دو تین مہینے مصروف ہو گیا۔ فری ہو کے میں نے ان سے مجموعے کی اشاعت کے تعلق سے بات کی تو انہوں نے جواب میں مجھے متحیر کر دیا، انہوں نے کہا:

''میرا مجموعہ تو شائع بھی ہو گیا۔''

مجھ پر شرم کی بجلی گر پڑی۔ ایک آدھ ہفتے میں کتاب مجھے موصول ہو گئی۔ ایک بار میں شعبہ اردو پہنچا۔ وہ صدر شعبہ تھیں۔ میں ان کے کمرے میں بیٹھا رہا۔ ان سے مختلف ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ دوپہر

ہوگئی۔کھانے کا وقت ہو گیا تو انہوں نے گھر سے لایا اپنا کھانا نکالا۔ ایک روٹی مجھے دی، ایک خود لی۔کھانے کے بعد انہوں نے گھر سے لایا انڈے کا اسپیشل حلوہ نکالا۔حلوہ بہت مزے دار تھا۔میں نے اس سے قبل اتنا مزیدار حلوہ نہیں کھایا تھا۔انہوں نے بتایا کہ حلوہ ان کی خود کی پرپیریشن (Preparation) ہے۔ان سے قریبی تعلقات ہو گئے تھے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی۔انہوں نے اپنے پہلے عہدہ صدارت میں شعبے کا جرنل ''ادبی قدریں'' شروع کیا۔مجھ سے ایک مضمون کے لئے کہا، میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

سبکدوش ہونے سے قبل وہ تحقیقی مقالوں کے لئے کافی پریشان تھیں۔دراصل رانچی یونیورسٹی میں ایک ایک سال تک تھیسس ڈسپیچ نہیں ہوتی تھی۔انہیں اپنے طالب علموں کی بہت فکر تھی۔وہ اکثر فون کرتیں اور پتہ کرتیں کہ تھیسس پہنچی کہ نہیں؟ ادھر ہم نے ''انٹرنیشنل ینگ اردو اسکالرز ایسوسی ایشن'' (ایوسا) کا قیام کیا اور اس تنظیم کی ہندوستان کی ریاستوں میں شاخیں کھولنے کا سلسلہ شروع کیا۔ہر شاخ میں دو اساتذہ کو کوآرڈینیٹر اور گیارہ ریسرچ اسکالروں کی ایک ٹیم بنائی جاتی تھی۔جھارکھنڈ کی ذمہ داری ہم نے ڈاکٹر کہکشاں پروین اور ڈاکٹر زین رامش کو دی۔ڈاکٹر کہکشاں پروین نے اسے نہ صرف بخوشی قبول کیا بلکہ دل و جان سے اس کی اشاعت و تبلیغ میں لگ گئیں۔تعارفی پروگرام کے لئے جب کوئی مناسب جگہ نہیں ملی تو انہوں نے پروگرام اپنے گھر پر رکھوایا۔جب ہم نے ہفتہ واری آن لائن ادبی پروگرام ''ادب نما'' شروع کیا تو انہوں نے کافی تعاون کیا۔ہم نے ''ادب نما'' کا ایک پروگرام ان کی افسانہ نگاری اور تنقید کے حوالے سے کیا۔ڈاکٹر کہکشاں پروین نے پروگرام میں بہت شاندار تقریر کی۔اسی پروگرام کا ان کا ایک جملہ نہ صرف اخبارات کی سرخی بنا بلکہ ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔انہوں نے کہا تھا:

''عورت کو محبت نہیں، عزت چاہیے۔''

ڈاکٹر کہکشاں پروین بہت زندہ دل تھیں۔انہوں نے ہمیشہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کی ہمت افزائی کی۔انہیں آگے بڑھانے کا کام کیا۔رانچی میں نوجوانوں کے درمیان وہ کافی مقبول تھیں۔آج رانچی کے نوجوان خود کو تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ان کا یوں چلے جانا ادبی حلقوں کو انگشت بدنداں کر گیا۔دراصل ان کے جانے سے اردو افسانہ نگاری، تنقید نگاری کا تو

سر سید احمد خاں

سر سید احمد خاں کے نام اور ان کے گونا گوں کارناموں سے ایک زمانہ واقف ہے۔ان کا پورا نام سید احمد خاں ابن میر متقی ہے۔ان کی ولادت ۱۷؍ اکتوبر ۱۸۱۷ کو دہلی میں اپنے نانا خواجہ فرید کے گھر ہوئی۔والد کی وفات کے بعد وہ اپنی والدہ کے زیر سایہ آداب و تربیت پاتے رہے۔ان کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق ہوئی تھی۔سر سید کی عملی زندگی کا آغاز ۱۸۳۷ء سے ہوا۔وہ ابتدا سے ہی مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے بے حد شوقین تھے اور ۱۸۴۱ء یعنی محض پچیس برس کی عمر تک وہ گیارہ کتابیں لکھ چکے تھے۔ان کی مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' ان کے ایام ملازمت ہی کی یادگار ہے۔ ۱۸۶۲ء میں غازی پور تبادلہ کے بعد انہوں نے وہاں ایک ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی۔اس سے ایک سال پہلے مرادآباد میں اور اس کے دو سال بعد غازی پور میں انہوں نے اسکول بھی کھولا تھا اور ایک انجمن بھی قائم کی تھی۔سر سید کا سفر انگلستان بھی ایک یادگار ہے، جہاں سے وہ مغربی طرز کا کالج کھولنے کا خیال لے کر وطن لوٹے تھے۔رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا اور ۲۳ مئی ۱۸۷۵ء کو ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کا قیام دراصل اسی خیال کی عملی شکل ہے۔جنوری ۱۹۲۱ء میں یہ کالج ''علی گڈھ مسلم یونیورسٹی'' بنا۔سر سید ایک بڑے مصلح اور معمار قوم ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے مصنف بھی تھے۔انہوں نے چھوٹی بڑی تیس سے زائد کتابیں لکھیں جن میں ''آثار الصنادید'' کے علاوہ ''ضلع بجنور کی تاریخ''، ''اسباب بغاوت ہند'' اور ''خطبات احمدیہ'' خاص طور سے مشہور و معروف ہیں۔سر سید کی وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ۹ بجے شب میں ہوئی۔ان کی ''یاد میں'' میں کئی ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہوئے ہیں۔

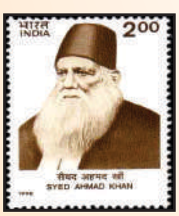

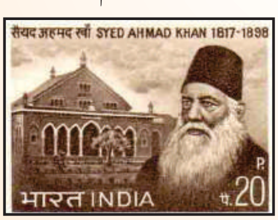

نقصان ہوا ہی، جھارکھنڈ کے ادب کا بڑا نقصان ہوا ہے۔انہوں اپنے دورِ صدارت میں شعبہ اردو کو کافی دور تک پہنچایا۔میگزین کا اجرا کیا۔ نیک (NAAC) میں شعبہ اردو کے کاموں کو روشنی میں لانے کا کام کیا۔

کہکشاں پروین اور ادب کی بات کی جائے تو انہوں نے اپنے قلم سے وہ کارنامے انجام دیے جو ہمیشہ قائم رہیں گے اور ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت کی عزت اور سماج میں اس کی حیثیت کو موضوعِ بحث بنایا، ان کے افسانوں کی عورت اتنی مجبور و بیکس نہیں ہے۔ ہاں کچھ افسانوں میں عورت مرداساس سماج کے ظلم کا نشانہ ضرور بنتی ہے، مگر ڈاکٹر کہکشاں پروین کے افسانوں کی عورت کبھی نہ انگڑائی لیتی ہے، نہ ادائیں دکھاتی ہے بلکہ وہ مردوں کے ظلم کے آگے سپر بن جاتی ہے، ورنہ اپنے کسی نہ کسی عمل سے اپنے اوپر ہوئے ظلم پر احتجاج کرتی ہے۔ کہکشاں پروین نے آدیباسی کردار، گھریلو عورتوں کے کردار اور کام کاجی عورتوں کے کردار پیش کئے ہیں۔ان کا مقصد عورتوں کو عزت دلانا ہے، وہ ایک ایسا سماج چاہتی ہیں جس میں برابری ہو، مرد عورت شانہ بشانہ ہوں اور مرد عورت مل کر صالح سماج کی تعمیر و تشکیل کریں۔

کہکشاں پروین کے کئی افسانوں میں آدیباسی مسائل کو الگ ڈھنگ سے اٹھایا گیا ہے۔انہوں نے آدیباسی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ دو وقت کی روٹی، ایک کپڑا اور گھاس پھونس کے عارضی کچے سے مکان کے لئے ان کی جد و جہد کو انہوں نے بہت قریب سے نہ صرف دیکھا بلکہ اسے محسوس کر کے اپنے اندر اتارا اور اپنے افسانوں میں حقیقی رنگ میں پیش کیا۔ خاص کر آدیباسی عورتوں کی جد و جہد بھری زندگی اور ان کی دن رات کی تگ و دو کو الفاظ کا جامہ پہنا کر افسانوں میں ڈھالا ہے۔

کہکشاں پروین کے افسانوں میں حقیقت نگاری ملتی ہے۔ گاؤں قصبات میں رہنے والے غریب اور مزدوروں کو انہوں نے موضوع بنایا۔ان کے افسانے پڑھتے ہوئے پریم چند، منٹو، واجدہ تبسم کا خیال آجاتا ہے۔اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ کہکشاں پروین نے ان کی تقلید کی ہے۔ان کے افسانے منفرد ہوتے ہیں اور وہ خالصتاً کہکشاں کے افسانے ہوتے ہیں، یہ بڑی بات ہے۔ وہ ایران توران کے موضوعات پر

پریم چند

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا اور ان کے والد کا نام منشی عجائب لال، وہ ایک کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور کسی وجہ سے انہوں نے اپنا قلمی نام پریم چند اختیار کر لیا تھا، یہاں تک کہ دنیائے ادب میں ان کی تمام تر شہرت و شناخت اسی نام سے ہے۔ منشی دھنپت رائے پریم چند کی تاریخ پیدائش ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء اور جائے پیدائش بنارس کا ایک دور افتادہ گاؤں پانڈے پور ہے۔ پریم چند کے والد محکمہ ڈاک میں ملازم تھے، گھر میں چنداں خوش حالی نہ تھی، چنانچہ شروع میں آٹھ سال تک اردو، فارسی اور انگریزی پڑھنے کے بعد کسی طرح کوئنس کالج بنارس کے طالب علم کی حیثیت سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور محکمہ تعلیم میں نوکری کر لی، پھر پرائیویٹ طور پر بی۔اے کرنے کے بعد ڈپٹی انسپکٹرس آف اسکول ہو گئے اور ۱۹۲۱ء میں ملازمت چھوڑ کر لکھنے پڑھنے کے کام میں لگ گئے۔ پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۸۹۸ء سے ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' ہے جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا اور حکومت کی طرف سے ضبط کر لیا گیا تھا۔ پریم چند کا قلم اردو اور ہندی کا سنگم تھا اور انہوں نے ''ہنس'' اور ''جاگرتی'' نامی دو رسالہ بھی نکالا تھا ''بازارِ حسن''، ''گوشہ عافیت''، ''نرملا''، ''چوگانِ ہستی''، ''میدانِ عمل'' اور ''گئودان'' ان کے مشہور ناول ہیں اور ''واردات''، ''زادِ راہ''، ''آخری تحفہ''، ''پریم پچیسی''، ''پریم بتیسی'' ان کے معروف افسانوی مجموعہ ہیں اور ''کفن'' ان کی یادگار کہانی۔ پریم چند نے ''کربلا'' نامی ڈرامہ اور سعدی شیرازی کی سوانح بھی لکھی ہے۔ وہ صرف فکشن نگار نہیں، بلکہ ایک اچھے مضمون نگار اور مترجم بھی تھے۔ ان کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے فکشن کا رشتہ دیہاتوں سے جوڑ دیا ہے۔ پریم چند کی وفات ۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ پریم چند پر یادگاری ڈاک ٹکٹ کا اجرا بھی عمل میں آچکا ہے۔

افسانے نہیں لکھتیں بلکہ اپنے آس پاس کی کہانیاں لکھتی ہیں اور کردار بھی جان پہچان کے اٹھاتی ہیں۔ ان کے معروف افسانوں میں ''ایک مٹھی دھوپ''، ''پانی کا چاند''، ''مور کے پاؤں''، ''تواہر کی عورت''، ''گرتی ہوئی عمارت''، ''بکھری ہوئی عورت''، ''کنیا پوجا''، ''آواز دے کوئی''، ''خوشبو''، ''بے دروازے کا گھر''، ''وارث''، ''واپسی کا سفر''، ''داتا''، ''عورت''، ''آسمان کا چاند''، ''دھوپ چھاؤں''، ''ٹھنڈی چائے'' وغیرہ ہیں۔

کہکشاں پروین کی پیدائش ۲۶ فروری ۱۹۵۶ میں ہوئی۔

آپ نے بوکارو مہیلا کالج سے شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی کا سفر طے کیا اور دو بار شعبۂ اردو کی صدر رہیں۔ آپ نے اپنی کئی سمت میں تحریر کی گئی کتابوں سے اردو والوں کو چونکایا۔ آپ نے پانچ افسانوی مجموعے، ''ایک مٹھی دھوپ''، ''دھوپ کا سفر''، ''سرخ لکیریں''، ''پانی کا چاند'' اور ''مور کے پاؤں'' اردو کو دیے۔ ان مجموعوں سے پورے جھارکھنڈ میں بطور افسانہ نگار اپنی الگ شناخت قائم کی، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو افسانے کے سفر میں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ یہی نہیں انہوں نے ادبی تنقید بھی لکھی۔ ''شیشۂ افکار'' اور ''نظریۂ ادب'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے دیے۔ تحقیق میں خود کو آزمایا۔ کئی کتابیں تحریر کیں۔ ''صالحہ عابد حسین بحیثیت ناول نگار''، ''منٹو اور بیدی کا تقابلی مطالعہ''، ''منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ'' تحریر کر کے بڑا کام کیا۔

اتنا سب کچھ لکھنے کے بعد شاعری بھی کی۔ ان کی شاعری کی ایک کتاب ''کیا رشتہ ہے میرا؟'' شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے، مگر ان سب کے باوجود ان کے اندر انکساری اور دوسروں کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر مصنف کو کبھی موت نہیں آتی۔ وہ جسمانی موت کے بعد ایک اور زندگی گزارتا ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

وہ شخص مصنف تھا ،اسے موت کہاں تھی
مر کر بھی وہ زندہ ہے کتابوں میں بسا ہے

جی ہاں! کہکشاں پروین جیسے مصنف مرا نہیں کرتے، بلکہ وہ اپنی کتابوں، بچوں اور طالب علموں کے ذریعہ زندہ رہتے ہیں کہکشاں پروین بھی اپنے ادبی کاموں بلکہ کارناموں کی بدولت زندہ ہیں اور رہیں گی۔ اب ان کے طالب علموں اور ادب کے پاسداروں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان کے ادھورے کاموں کو پورا کر کے انہیں ایک سچا خراج پیش کریں۔ ایک استاد کی اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوگی کہ اس کے شاگرد لائق و

مجاز لکھنوی

مجازؔ لکھنوی کا پورا نام اسرار الحق ابن سراج الحق ہے، لیکن جہان سخن میں وہ اپنے تخلص ہی سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۹، اکتوبر ۱۹۱۱ء اور جائے ولادت ردولی، بارہ بنکی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں علی گڈھ سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اور پھر کچھ دنوں بمبئی کے محکمۂ اطلاعات سے وابستہ رہے، پھر حلقہ ادب لکھنؤ کے فعال کارکنوں اور ادارہ ''نیا ادب'' میں رہنے کے بعد ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ملازمت اختیار کی۔ مجازؔ اپنے وقت کے اُن گنے چنے شاعروں میں تھے، جن کی مقبولیت اس طرح ایک کریز (Craza) بن گئی تھی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے گرلز ہاسٹل کی لڑکیاں ان کے نام کی قرعہ اندازی کیا کرتی تھیں کہ مجازؔ سے عشق کا حق کس کے حصہ میں زیادہ آتا ہے۔ مجازؔ کی شاعری لکھنؤ، علی گڈھ اور دہلی کی فضا میں پروان چڑھی۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر ایک عاشق مزاج اور رومانی شاعر تھے، لیکن ان کی شاعری کا ایک دوسرا انقلابی رُخ بھی ہے اس لئے کہ وہ تمام عمر اپنی شاعری سے نوجوانوں کو فرسودہ نظام کے بدلنے کی دعوت دیتے رہے۔ مجازؔ کا مجموعہ کلام ''آہنگ'' پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں چھپا تھا، پھر کچھ اضافوں کے ساتھ دوسری بار ''شب تاب'' کے نام سے اور تیسری بار ''ساز نو'' کے نام سے طبع ہوا۔ ''نوجوان خاتون''، ''آوارہ''، ''رات اور ریل'' اور ''میرا چمن'' ان کی مشہور ترین نظمیں ہیں۔

مجازؔ کا کلام فلم ''غلامی''، ''ٹھوکر'' اور ''آسمان محل'' میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مجازؔ کا انتقال ۵/دسمبر ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ ان کی یاد میں ۲۰۰۸ء میں محکمہ ڈاک نے ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا تھا۔

فائق ہوں، اس معاملے میں کہکشاں پروین خوش قسمت تھیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کے شاگرد، ان کے کاموں کو آگے بڑھائیں گے۔

کہکشاں پروین کا ایک معروف افسانہ ''تواپر کی عورت'' ہے۔اس افسانے کی مرکزی کردار عورت ہے۔ یہ افسانہ عورتوں کے حق میں آواز بلند کرنے کی بہترین مثال ہے۔عورت کی زندگی کیا ہے؟ ذمہ داریوں کا ایک بوجھ، صبح سے شام نہیں رات کو بستر پر جانے تک فرائض ایک کی طویل فہرست ہوتی ہے۔صبح پہلے خود اٹھنا، تمام ضروریات سے فارغ ہوکر گھر کے تمام چھوٹے بڑوں کو جگانا اور ان کا الگ الگ انتظام کرنا، ایک گھریلو عورت کی شروعات عموماً کچھ اسی طرح ہوتی ہے۔ بچے، شوہر، ساس، سسر کوئی بھی اس کا غم دیکھنے اور محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔اس کے سب اپنے ہیں، مگر اس کے درد اور غم سے ناآشنا ہیں۔ بظاہر یہ گھر اس کا ہے، مگر صرف نوکرانی کی طرح کام کرنے کے لئے صرف گھر اس کا ہے۔کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دیتا بلکہ اپنے کاموں کا حکم دیتا ہے۔کسی کا اگر کوئی کام نہ ہوا تو، وہ گھر، سر پر اٹھالیتا ہے، خوب شور مچاتا ہے اور کسی چیز کے گم ہوجانے کا الزام اس پر بہ آسانی لگا دیتا ہے۔ مذکورہ افسانے ''تواپر کی عورت'' میں بھی کہکشاں پروین نے عورت کے ایسے ہی مسائل اور کشمکش بھری زندگی جینے اور اسے اپنے افسانے میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔افسانے میں ایک کام والی ہے۔ ورشا اس کے درد کو جانتی ہے تبھی تو وہ اس کے لیٹ آنے پر کچھ نہیں کہتی:

> ''تو وہ صاف کہہ دیتی، بی بی گھر سے نپٹ کر ہی آنا ہے۔ اتنا تو وہ سمجھتی ہی تھی کہ آیا کا بھی گھر ہے، گھر کے فرائض ہیں۔ وہ جتنی دیر کے لئے آجاتی وہ غنیمت ہے...... جلدی جلدی ناشتہ بنا کر وہ پھر کمرے میں آئی...... بچے سوئے ہوئے تھے۔ پنکی...... گڈو...... دھیمے سر میں وہ انہیں پکار رہی تھی......آکاش نے پلٹ کر اسے دیکھا اور ہمیشہ کی طرح 'کیا مصیبت ہے' کہہ کر پھر سوگیا۔ ورشا نے بھی روز کی طرح رشک سے اسے دیکھا۔مصیبت تو صحیح معنوں میں اس پر ہے۔ اس نے اپنی موجودہ

مجروح سلطان پوری

مجروح سلطان پوری کا اصل نام اسرارالحسن خان، آبائی وطن سلطان پور نامی گاؤں، تاریخ ولادت یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء اور جائے ولادت اعظم گڈھ ہے۔ مجروح کے والد سب انسپکٹر تھے، انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم کا خاص اہتمام رکھا۔اسرارالحسن نے ساتویں جماعت کے بعد درس نظامی کی تکمیل کی اور پھر الطب کالج لکھنؤ میں یونانی طریقہ علاج کی تعلیم پائی اور طبابت کے پیشے سے بھی منسلک رہے۔ مجروح اگرچہ اپنی اسناد تعلیم کے لحاظ سے مولوی، عالم اور طبیب تھے، لیکن ان کا فطری رجحان ابتدا ہی سے شعروشاعری کی طرف تھا اور بالآخر اسی میدان کا انہوں نے اپنے لئے انتخاب کیا اور اردو کے کامیاب شاعر، خصوصاً ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے اہم ستون اور فلم نگری میں اودھی کلچر کے مستند سفیر کہلاتے ہیں۔۱۹۴۵ء سے وہ مستقل بمبئی میں مقیم رہے۔ان کا پہلا گیت ''غم دے مستقل''، فلم ''شاہجہاں'' کے لئے تھا جو بے حد پسند کیا گیا۔انہوں نے تقریباً نصف صدی تک، تین سو سے زائد فلموں کے لئے ہزاروں گیت لکھے جو مجروح کے فلمی نغموں کی حیثیت سے آج بھی مقبول ہیں۔ ''دادا صاحب پھالکے ایوارڈ'' یافتہ فلمی دنیا کے اولین نغمہ نگار ہونے کا شرف رکھنے والے مجروح سلطان پوری، اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل میں بھی بہت اونچا مرتبہ رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ مشاعروں میں اپنی تازہ غزل ہی سناتے تھے، انہیں ادبی خدمات کے لئے ''اقبال سمان ایوارڈ'' بھی ملا تھا۔ مجروح سلطان پوری کا مجموعہ ''غزل'' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں چھپا تھا، جس کی دوسری اشاعت ۱۹۹۹ء میں ''مشعل جاں'' کے نام سے ہوئی۔ مجروح کی تاریخ وفات ۲۴ مئی ۲۰۰۰ء ہے۔ محکمہ ڈاک نے ان کی یاد میں ۲۰۱۳ء میں ایک خوبصورت ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا۔

حیثیت کاتعین کیا......گھر کا تصور کب ختم ہوا......کب وہ
ہر رشتہ سے دور ہو کر ایک بندھوا مزدور بن گئی۔ یہ وہ جان
نہ سکی...... اب وہ کوشش کرتی، لیکن تار و پود کا الجھا ہوا
سرا کسی نتیجے پر نہ پہنچاتا۔''

درجِ بالا اقتباس میں ورشا اپنے بچوں (پنکی اور گڈو) اور شوہر کو بیدار کرتی ہے۔ اسے اپنے شوہر کی بے خبری کی نیند پر رشک بھی آتا ہے، پھر وہ اپنے آپ پر غور کرتی ہے۔ وہ ہر طرح سے پریشان تھی۔ گھر کا تصور تو اس کے دل و دماغ سے کب کا مٹ چکا تھا۔ اب تو وہ ایک بندھوا مزدور ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی بہت کوشش کرتی، مگر ڈور اتنی الجھ گئی تھی کہ کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ اس کی حالت بالکل توے جیسی ہوگئی تھی کہ جس طرح توا جلتے چولہے پر چڑھتا ہے، اسی طرح وہ دن بھر شوہر، بچوں اور دوسرے افراد کے لئے توا ہو کر رہ گئی تھی، جسے ہر حال روٹی سینکنا ہوتا ہے۔ وہ بھی جذبات کو سینے میں دبائے اندر اندر سلگ رہی تھی:

''بابو جی کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے لئے پرہیزی کھانا بنا دینا'......'میں نے دوا بھی دے دی ہے۔' ورشا بولی......'سنو بچوں کے ٹسٹ ہونے والے ہیں تم ذرا چیک کرلوگی'......' آکاش فرائض کی زنجیریں پھینکتا جارہا تھا'......'ایسا کرو آج تم بابو جی کو ڈاکٹر کو دکھادو'......'آج تو مجھے کالج میں دیر ہوگئی'......ورشا آہستہ سے بولی......'وہ تم مینج (Manage) کرلوگی۔' وہ اٹھ کر چلا گیا۔'' (افسانہ: توا پر کی عورت)

دیکھا آپ نے شوہر کا رویہ! وہ ہر وقت جلدی میں ہوتا ہے۔ وہ اتنا مصروف ہے کہ اسے اپنے فرائض کا بھی خیال نہیں۔ ماں باپ کے تئیں اس کا کیا فرض ہے، اسے کچھ پتہ نہیں۔ یہ تو ہندوستانی سماج ہے کہ ساس سسر کے کام کی ذمہ داری اس کی ہے، ورنہ اسلامی معاشرے میں یہ سب بیوی کے فرائض میں شامل نہیں۔ آکاش کتنا لاپرواہ یا چالاک ہے کہ تمام بوجھ ورشا کے کاندھوں پر ڈال کر بے فکر ہو جاتا ہے۔ اسے علم ہے کہ ورشا یہ سب مینج کرلے گی۔ وہ بچوں کو اسکول بھی بھیج دے گی، والدین کی دوا دارو بھی کرلے گی اور خود اسکول بھی چلی جائے گی۔ بابو جی کو ڈاکٹر کو بھی دکھالائے گی۔

افسانے کے کرداروں کے نام دیکھیں۔ یہاں بھی انفرادیت نظر آتی ہے۔ ورشا اور آکاش۔ میاں بیوی۔ ورشا یعنی بارش، جس کے لئے آسمان کا ہونا ضروری ہی نہیں لازمی ہے۔ آکاش یعنی آسمان۔ وہ آسمان ہی کیا جس سے بارش کا نزول نہ ہو۔ یعنی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم۔ یہ اور اتنا قریبی رشتہ تو میاں بیوی کا ہی ہوتا ہے۔ اب ذرا ورشا کی زندگی کے نشیب و فراز پر غور کریں۔ ورشا اپنے فرائض کی بارش سب پر کرتی ہے اور خود بھوکی رہتی ہے اور ہمدردی کے ایک ایک لمحے کے لئے ترستی ہے۔ ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ اس پر ہے کہ گھر کا تصور اس کے یہاں بالکل مٹ سا گیا ہے۔ گھر کا لطف کہیں گم ہو گیا ہے۔

دراصل کالج جانا، بیمار ساس سسر کو دیکھنا، بچوں کی ضدیں پوری کرنا، شوہر کے کام اور نخرے برداشت کرنا، یہ سب اس کے فرائض میں ہیں، مگر اس کے حقوق کچھ بھی نہیں۔ شوہر اس سے انکم ٹیکس بھرنے اور ریٹرن جمع کرنے کی بات کرتا ہے، وہ انجان بن جاتی ہے۔ یہاں کہانی میں بھرپور طنز موجود ہے۔ یہ کہکشاں پروین کا کمال ہے کہ وہ بات بات میں طنز کے تیر کچھ اس طور چلاتی ہیں کہ مخاطب کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ ورشا ریٹرن لفظ سے واقف نہیں کہ اس نے کبھی ریٹرن پایا ہی نہیں۔ وہ دن رات خود کو گھر کے کاموں میں کھپاتی ہے، جلاتی ہے، مگر ریٹرن کے طور پر اسے کیا ملتا ہے، پیار بھرے دو لفظ بھی نہیں:

''ہاں ہمیشہ دیتی ہوں......ورشا سنبھل کر بولی پھر سوچنے لگی واقعی ٹیکس تو وہ ہمیشہ دیتی آئی ہے۔ ہر رشتہ کا اپنا ٹیکس مقرر ہے جسے وقت پر نہ دیا جائے تو جرمانہ بھرنا پڑتا ہے......اس جرمانہ کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جیسی صورت میں مل جاتا ہے......'ہمیشہ دینے سے کیا مطلب اس کا حساب رکھنا ہے۔ ریٹرن بھرنے کے وقت اس کا حساب دینا پڑتا ہے، پھر ریٹرن ملتا ہے۔' آکاش حساب میں مکمل تھا......'ریٹرن کیا ہوتا ہے۔' ورشا تلخی سے مسکرائی۔''

ورشا اپنے شوہر کو کوئی جواب نہیں دیتی، لیکن قاری اس کے درد کو سمجھ لیتا

ہے۔وہ دراصل انکم ٹیکس بھی دیتی اور ریٹرن بھی بھرتی ہے،مگر ریٹرن کا دوسرا مطلب نکال کر یہاں مصنفہ نے قاری کو اپنے سے جوڑ لیا ہے۔آ کاش بے وفا نہیں ہے،لیکن وہ مادیت پرست ہے،معاشیات کی فکر میں غلطاں رہتا ہے۔اسے پتہ ہی نہیں ایک عورت کے فرائض ہی نہیں کچھ حقوق بھی ہوتے ہیں۔اسے گھر کے کاموں کے علاوہ پیار اور محبت بھی چاہیے۔

ورشا ایک ایسی عورت تھی جو دن رات کی ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے مثبت سے منفی سوچ کی حامل ہوتی جارہی تھی۔اس کے اندر ممتا ختم ہوتی جارہی تھی،شوہر پر فدا ہونے کا جذبہ کھوتا جارہا تھا، ساس سسر کو ماں باپ مان کر ان کی خدمت کرنا،اسے ڈرامہ لگنے لگا تھا۔ اسے اپنے چاروں طرف جھوٹ،مکاری،فریب،دھوکہ،بناوٹ،ایکٹنگ کا ایسا خول چڑھا ہوا لگتا جسے وہ اپنی جان تک لگا کر توڑ نہیں پارہی تھی۔ اس نے اس گھر کے لئے خود کو مٹا ڈالا تھا۔اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر گھر کے ہر فرد کا خیال رکھا تھا۔کیا بچے،کیا شوہر اور کیا ساس سسر،اس نے تو سب کے لئے خود کو نیست و نابود کر دیا تھا۔اپنے دکھ درد کی پرواہ کئے بغیر اس نے گھر کے تمام لوگوں کی خوشیوں کو ہمیشہ مقدم جانا،مگر اس کا صلہ کیا ملا:

''زندگی یہی ہے۔'اس کی عزیز سہیلی نے اس کی دلجوئی کی۔'یہی فرائض تمہاری پہچان ہیں'،'میں شب و روز کے ان تارو پود سے نہیں گھبراتی جو مجھے زنجیر بن کر حالات سے باندھے ہوئے ہیں۔بس کمی وبیشی کی آنکھ مچولی مجھے بیقرار رکھتی ہے'......ورشا اسے سمجھا نہ سکی۔حالات سے وہ نباہ تو کر رہی تھی،لیکن اس نباہ میں اس کی سوچ جدا جدا تھی......'یہ عورت کچھ سمجھتی نہیں پتہ نہیں کس مرض کی دوا ہے۔' آ کاش کہہ رہا تھا۔اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوگئی تھی ......'بہو جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے۔' یہ ساس کی آواز تھی......'مس نے مارا،مجھے ممی نے کل ہوم ورک نہیں کروایا' پپو رو رہا تھا ......'میڈم ہمیں سلیبس پورے کروا دیجئے۔'اسٹوڈنٹ کہہ رہے تھے ......'اس فنکشن کو کامیاب بنانا آپ کی ذمہ داری ہے۔'پرنسپل کی آواز تھی......'اپنی ڈیوٹی پوری کرنا ہی ہمارا سب سے بڑا کرتو یہ ہے'......مہمان خصوصی تقریر کر رہے تھے۔''

یہ سب اس کی دن رات کی محنت کا صلہ تھا۔اس کا اعتبار ان سب مادّی چیزوں سے اٹھ گیا تھا۔وہ ان سب سے بیزار ہوگئی تھی۔اس کی زندگی میں سنہرے دن کب آئے،کب رخصت ہوگئے،اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

شادی کے بعد کے وہ دن اسے یاد ہی نہیں تھے کہ اس کی گود ہری ہوگئی تھی۔اس نے یکے بعد دیگرے پنکی اور گڈو کو جنم دیا تھا۔ اس کی ذمہ داریوں کے دوسرے لفظوں میں سنہرے دن کے رخصت ہونے کے دن کی شروعات ہوگئی تھی۔یہ دن ایسے غائب ہوئے کہ کبھی آئے ہی نہیں تھے۔آ کاش اپنی زندگی میں مصروف ہو چکے تھے۔وہ صرف حکم چلانا جانتے تھے،اس سے آگے انہیں کچھ پتہ نہیں تھا اور اس کی ذمہ داری پنکی،گڈو،ساس،سسر اور سب سے زیادہ آ کاش کے تئیں ہوگئی تھی۔

اس کے علاوہ وہ اسکول کی بھی ذمہ دار تھی۔وہ اپنی تمام ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھا رہی تھی۔بچے بڑے ہوئے تو اس کا بوجھ کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا تھا۔اب وہ انہیں اسکول کے لئے تیار بھی کرتی،ناشتہ تیار کرتی،ٹفن بناتی،رکشہ تک چھوڑنے جاتی،شام کو ان کا ہوم ورک کراتی۔

سسر کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ان کی دوا پانی کا خیال بھی رکھتی۔ساس کے طعنے الگ،شوہر کے بار بار حکم بھی سنتی۔اس کی قسمت میں پیار کے دو بول بھی نہیں تھے۔ایسا کرتے کرتے اب وہ اوب گئی تھی۔ ثواب،نیکی،آرام سب اس کی نظر میں عجیب لگنے لگے تھے۔خونی رشتے بھی اب اسے بوجھ معلوم ہوتے۔دنیا سے اس کا یقین اب اٹھ گیا تھا۔

اس کے دل میں رشتوں کا کھوکھلا پن سما گیا تھا۔اس کے دل میں ممتا نام کی چیز باقی نہیں بچی تھی۔بچوں سے محبت وہ مشین کی طرح کرتی۔شوہر،آ کاش تو اب ایسا آسمان بن چکا تھا کہ اس سے صرف بجلیاں گرجتیں،وہ زمین کی حفاظت اور خیال کیا رکھتا وہ تو خود میں ہی مصروف تھا۔اس کے لئے صرف پیسوں کی اہمیت تھی۔وہ تو صرف انکم ٹیکس اور ریٹرن کے بارے میں پوچھتا۔اسے تو ان الفاظ کے مفہوم تک پتہ نہیں تھے۔طنز و مزاح تو اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔

اس کے دل میں بھی شوہر کی اہمیت صرف اتنی رہ گئی تھی کہ وہ

بس آ کاش تھا۔ احترام، محبت، الفت و یگانگت جیسے جذبے تو کب کے رخصت ہو چکے تھے۔ اسے تو اب ہمدردی بھی نہیں رہی تھی۔ ساس کے طعنے اور سسر کی تیمارداری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ تو ایسی عورت بن چکی تھی، جس کا خونی رشتوں پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ وہ تو توے کی طرح ہر وقت جلا کرتی اور گھر والوں کو گرم و تازہ روٹیاں دیتی۔ کوئی یہ خیال نہیں کرتا کہ توے کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔ اسے بھی پیار اور محبت چاہیے۔ اس کے پاس بھی دل ہے اور اس کے کچھ ارمان بھی زندہ ہوں گے۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ اس کے سب ارمان توے پر چولہے کی آگ میں جل گئے تھے۔

اس کے چاروں طرف گرمی ہی گرمی تھی۔ ساس سسر کے طعنوں کی گرمی، شوہر کے حکموں کی آنچ، بچوں کی مصروفیت کی تپش، اسٹوڈنٹس کی نصاب پورا کرانے کی مانگ، پرنسپل کی پروگراموں کو کامیاب بنانے کی تاکید، مہمانِ خصوصی کی اپنے کرتوتوں کی سیکھ، یہ سب اس کے چاروں طرف آگ کی صورت پھیل چکے تھے۔

کہانی کا اختتام دیکھیں۔ یہاں کوئی چونکانے کا عمل نہیں ہے، کوئی بڑا فلسفہ نہیں ہے، کوئی گھن گرج نہیں ہے۔ کہانی آہستگی سے ختم ہو جاتی ہے بس ایک عورت کے توے کی مانند جلنے کا احساس قاری کو شدت کے ساتھ ہوتا ہے، یہ شدت اتنی ہوتی کہ کہانی کا سفر قاری کے دل و دماغ میں شروع ہو جاتا ہے:

''حالات کی آنچ تیز ہوئی یا زندگی کا توا ہی زیادہ گرم ہو گیا۔ بہر حال جلنا اسے ہی تھا...... ملائم خوشبودار سلونے روپ کی بجائے اب وہ جلی ہوئی اکڑی روٹی کی شکل میں پڑی تھی اور راکھ ہو جانے کا ایک مرحلہ ابھی باقی ہی تھا۔''

افسانہ یہاں ختم ہو جاتا ہے، مگر ایک جلی ہوئی روٹی کی شکل میں ورشا، جلی ہوئی پڑی ہے، لیکن ابھی وہ راکھ نہیں ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک مرحلہ ہے جس میں سماج، معاشرے اور خاندان کے افراد کی بے اعتنائی کی آگ اور شعلوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کہانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ توے کی قسمت صرف جلنا ہوتا ہے۔ راکھ ہونا اس کے مقدر میں نہیں۔ اس کو تو ہر حال میں بس جلنا ہی ہے۔

ورشا کی قسمت میں بھی گھر کے حالات کی آگ میں جلنا اور جلنا ہے۔ کوئی آ کاش اپنی ورشا سے اسے جلنے سے نہیں روک سکتا۔ اسے تو آ کاش کی محبت کی دھیمی دھیمی پھوار چاہیے۔ بچوں کے پیار کے چھینٹے چاہیں۔ ساس سسر کی الفت کا چھڑکاؤ چاہیے۔ شاید اس کی قسمت میں یہ سب نہیں۔ اسے تو، توے کی طرح ہمیشہ جلنا ہے اور دوسروں کو اچھی روٹی فراہم کرنا ہے۔ اس موقع پر مجھے سلمیٰ صنم کی ایک کہانی ''تھکی ہوئی ناری'' یاد آرہی ہے۔ بالکل اسی طرح ایک عورت اپنے گھر، بچوں اور شوہر کے لئے کام کرتے کرتے تھک جاتی ہے، مگر اس کے شوہر اور بچے، اس کا سارا کام خود سنبھالیتے ہیں اور اسے آرام کراتے ہیں۔ عورت پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے، مگر یہاں ورشا کا ساتھ اس کے بچے دیتے ہیں نہ شوہر۔ وہ اکیلی ہی ذمہ داریوں کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ ❁❁

تازہ نگارشات مطلوب ہیں

اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کے لئے قلم کار حضرات شعری و نثری صنف ادب پر اپنی غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ، تازہ ترین تخلیقات ہمیں ارسال کریں۔ آپ کی معیاری ادبی و تنقیدی اور تحقیقی و تخلیقی نگارشات کے ساتھ ساتھ آپ کی ایسی تخلیقات کا بھی ہمیں خصوصیت سے انتظار ہے جو اصناف ادب کی تاریخ، اس کے فن پر ہوں اور مقابلہ جاتی امتحانات کے طلبا و طالبات کے لئے مفید مطالعہ ہوں۔ ہمیں بچوں کے لئے بھی نثری و شعری تخلیقات خصوصاً مختصر مضامین، کہانیاں اور نظمیں مطلوب ہیں۔ تخلیقات کے ساتھ اپنی تصویریں بھی ارسال کریں۔ نگارشات صفحہ کے ایک طرف املا و انشا کی غلطیوں سے پاک صاف اور خوش خط لکھی ہوئی ہوں یا صحت و صفائی کے ساتھ کمپوز شدہ ہوں۔ ساتھ ہی نام، مکمل پتہ اردو اور انگریزی میں، ڈاکخانہ کا پن کوڈ، اپنے موبائیل کا نمبر بھی لکھیں اور بینک کھاتہ جس نام سے ہے وہ نام، کاؤنٹ نمبر، آئی ایف کوڈ بھی لکھیں۔ تخلیقات کے ساتھ غیر مطبوعہ غیر نشر شدہ خاص برائے ''زبان وادب'' لکھنا بھی نہ بھولیں۔ تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں مدیر کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ تخلیق کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، زیراکس یا فوٹو اسٹیٹ کاپی نہ بھیجیں۔

مدیر/معاون مدیر ''زبان وادب'' اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

نثار احمد صدیقی
Muslimabad, Near Gowardhan, Maidan, Haspura-824120 (Mob.9546308801)

ظفر اوگانوی: یادیں اور باتیں

ظفر اوگانوی کا ذکر کروں تو کہاں سے کروں......؟ ''پہلی کوٹھی'' (رمنہ روڈ، پٹنہ) سے، سبزی باغ سے یا پھر ادیبوں کے اڈہ ''رحمانیہ ہوٹل'' سے......؟ میری پہلی ملاقات ظفر اوگانوی سے ''پہلی کوٹھی'' یا ''بک امپوریم''، سبزی باغ میں نہیں ہوئی تھی بلکہ نیشنل وانٹرنیشنل ادیبوں کے اڈہ ''رحمانیہ ہوٹل'' (سبزی باغ) میں علی حیدر ملک نے مجھے اُن سے متعارف کرایا تھا۔ اس وقت ظہیر صدیقی، نورالہدیٰ، سید نسیم مظفر پوری، شبنم یزدانی، واثق نظام پوری اور طارق ندیم موجود تھے۔ ان لوگوں سے بھی یکے بعد دیگرے متعارف کراتے ہوئے ہم دونوں کرسی لے کر بیٹھ گئے۔ ظفر اوگانوی نے مجھ سے پوچھا:

''آپ ادب کی کس صنف سے دلچسپی رکھتے ہیں؟''

میں نے جواب میں کہا:

''جناب مجھے فکشن سے زیادہ دلچسپی ہے۔''

پھر انہوں نے دوسرا سوال کیا:

''آپ کی سب سے پہلی کہانی کون سی ہے اور کس رسالے یا اخبار میں شائع ہوئی؟''

میں نے اس سوال کا جواب تفصیل سے دیتے ہوئے کہا:

''میری سب سے پہلی کہانی بچوں کے لیے تھی جس کا عنوان 'کوشش' تھا۔ یہ کہانی بچوں کے ہفتہ وار رسالہ 'غنچہ' (بجنور) میں ۱۹۶۰ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی اور 'پرکھ' کے عنوان سے پہلا افسانہ ہفتہ وار 'سوتنترتا' (پٹنہ) میں ۱۹۶۲ء کے کسی ماہ کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا۔ اس کے بعد گاہے گاہے بچوں کی کہانیاں اور افسانے ہندو پاک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے، جن میں قابل ذکر رسالوں میں 'کلیاں'، 'پھلواری'، 'غنچہ'، 'پھول'، 'ٹافی'، 'کھلونا' اور 'نور' ہیں اور افسانے 'سوداگر'، 'جام نو'، 'کونپل'، 'شاخسار'، 'سنگم'، 'ادب لطیف'، 'فنون' وغیرہ میں۔''

یہ سن کر سب یاران ادب نے خوشی کا اظہار کیا اور پھر ظفر اوگانوی نے متاثر ہو کر علی حیدر ملک کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا:

''چلیئے جناب تمہارے شہر میں ایک فن کار تو ہے۔''

''معاف کرنا ظفر صاحب ایسی بات نہیں۔ اسی شہر میں عبدالمغنی، مظفر اقبال، ابوذر عثمانی، ذکی اورنگ آبادی، ساحل اورنگ آبادی، ش۔ م۔ دامن اور کئی پرانے اور نئی نسل کے فن کار آپ کو نظر آئیں گے۔''

علی حیدر ملک دوٹوک جواب دے کر خاموش ہو گئے۔ اسی وقت نورالہدیٰ نے چائے وائے کا آرڈر دے دیا۔ ہوٹل مالک نے کاؤنٹر سے ہی پوچھا:

''چائے کے ساتھ کون سا 'وائے' بھیجا جائے؟''

''نمک پارہ!'' مختصر جواب دے کر نورالہدیٰ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد چائے، وائے آ گئی۔ ہم سب یاران ادب چائے کی چسکی کے ساتھ ''وائے'' سے بھی شغل کرتے رہے۔ مختلف ادبی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ چائے ختم ہوتے ہی ظہیر صدیقی اپنی نشست سے اٹھے اور بغیر بتائے ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ نورالہدیٰ نے ظہیر صدیقی کے جانے کے بعد یاران ادب سے مخاطب ہو کر کہا:

''ظہیر صدیقی دراصل شاعر ہیں...... ہیجانی کیفیت، لا ابالی پن ہونا لازمی ہے۔''

شبنم یزدانی نے ترکی بہ ترکی کہا:

''ارے بھائی ظہیر صدیقی ہی نہیں بلکہ ہر شاعر کی یہی حالت ہے۔ دیکھئے نا جمیل مظہری، رضا نقوی واہی، رمز عظیم آبادی اور دوسرے شعرا کو...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

ظفر اوگانوی نے حامی بھرتے ہوئے کہا:

''یہ بات سچ ہے۔''

طارق استھانوی کوعلی حیدر ملک نے چھیڑتے ہوئے کہا:

''کیا حال ہے بھائی م۔صبوحی کا''

اس زمانے میں م۔صبوحی سے طارق کا عشق چل رہا تھا)طارق استھانوی نے بتایا کہ وہ آج کل بیمار چل رہی ہیں۔ابھی ابھی ان کی کہانی ماہنامہ''خیال''میں شائع ہوئی ہے۔بہت خوبصورت کہانی ہے۔

''ہاں بھائی...... ہاں،م صبوحی بھی تو خوبصورت و دل کش ہیں،پھران کی کہانی کیوں خوبصورت نہ ہو؟''

نسیم مظفر پوری یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔

''نہیں بھائی،میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کہانی معیاری اوراس کا پلاٹ اچھوتا ہے۔''طارق ندیم نے جواب دیا۔

اسی درمیان ظہیر صدیقی ایک نئے شخص (میرے لیے) کے ساتھ رحمانیہ ہوٹل میں داخل ہوئے۔سب ہی لوگ اس اجنبی شخص کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔میں بھی حیرت زدہ کھڑا ہوگیا۔ظفراوگانوی نے اس اجنبی شخص کوکرسی پیش کرتے ہوئے کہا:

''حضورتشریف رکھئے!''

اس اجنبی شخص نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

''ان حضرت کو میں پہچان نہیں پارہا ہوں؟''

ظفراوگانوی نے میرانام اورکام بتایا تو وہ اجنبی شخص اٹھ کھڑے ہوئے اور گلے لگالیا۔میں حیرت زدہ رہ گیا کیوں کہ میں اب تک اس اجنبی شخص سے محتاج تعارف تھا۔میں اس اجنبی شخص سے خودہی سوال کر بیٹھا۔

''حضور......!''

''ہاں،ہاں،میں حسن عسکری ہوں''

میں حسن عسکری کے نام سے واقف تھا۔ میں چونک پڑا کیوں کہ ہندوستان کا ایک بڑا تاریخ داں پروفیسر میرے سامنے موجود تھا۔ان کی پوشاک بالکل سادہ تھی،صرف ایک قمیص اور پائجامہ میں ملبوس تھے۔میں نے انہیں بغور دیکھا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص ہندوستان کا مایہ ناز تاریخ داں کیسے ہوگیا؟انہیں تو تھری پیس سوٹ میں ملبوس رہنا چاہئے تھا

اور یہ معمولی مسلم ہوٹل میں ہم سب ادنیٰ ادیب وطالب علموں کے ساتھ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔وہ کبھی کبھی خلا میں گھورنے لگتے،ایسا معلوم ہوتا کہ انہیں کسی چیز کی تلاش ہے،پھر کبھی نیم خبطی جیسی کیفیت بھی دیکھنے کو ملی۔یک بیک حسن عسکری اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ہم سب بھی ان کے پیچھے ہولیے۔ میں نے دیکھا ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل ہاتھ میں لیے سبزی باغ روڈ پر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے رفو چکر ہوگئے۔ہم سب انہیں دیکھتے رہے۔

اس وقت رات کے دس بج چکے تھے اس لئے ہم سب اپنی اپنی راہ ہولیے۔علی حیدر ملک،ظفراوگانوی،نورالہدیٰ اور راقم الحروف اشوک راج پتھ سے پورب کی جانب چل پڑے،تھوڑی دور جانے کے بعدرمنہ روڈ کی گلی میں آگئے۔''پیلی کوٹھی'' کے سامنے ایک بڑی حویلی کے پھاٹک سے نورالہدیٰ اندر چلے گئے۔ظفراوگانوی،علی حیدر ملک اور میں''پیلی کوٹھی'' کے ایک کمرہ میں جاکرایک پلنگ پر جابیٹھے۔تھوڑی دیر بعدظفراوگانوی مجھے لے کراسی''پیلی کوٹھی'' کے دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ہم دونوں فکشن پرمحوگفتگو رہے۔ظفراوگانوی نے قرۃالعین حیدرکواردو کا سب سے اعلیٰ فکشن نگار بتایا اور کرشن چندر کو چھوٹے قد کا فکشن نگار کہا۔مجھے تعجب ہوا،لیکن میں خاموش رہا کیوں کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ ہم سے زیادہ تھا۔ میں نے بیدی،منٹو،عصمت اور مہندرناتھ کی فکشن نگاری سے متعلق ان کا نظریہ جاننا چاہا تو انہوں نے مختصراً کہا:

''بیدی کا افسانہ فکر کی ترغیب دیتا ہے،سعادت حسن منٹو فرائڈ سے زیادہ متاثر ہیں،لیکن ان کے چندافسانے سوچ کی ترغیب دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔عصمت چغتائی کے زیادہ تر افسانے عورتوں کے جنسی مسائل اور مردوں سے بغاوت پر مبنی ہیں۔مہندرناتھ کے افسانوں

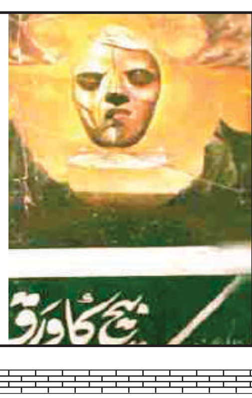

میں مسائل درمسائل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ سب فکشن نگار کرشن چندر سے بہتر اور اپنے افسانوں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔‘‘

میں نے بہار کے افسانہ نگاروں سے متعلق گفتگو کرنا چاہا تو انہوں نے کہا:

’’پھر کبھی......‘‘

میں خاموشی سے اٹھ کر علی حیدر ملک کے کمرہ میں جا کر ایک بیڈ پر سو گیا۔

دوسرے دن میں (دیگھا گھاٹ)’’نواب کوٹھی‘‘ چلا گیا۔ وہاں میرا شدت کے ساتھ اکرام الدین فرحت اور عتیق اللہ انتظار کر رہے تھے۔ اکرام الدین فرحت نے مجھ سے کہا:

’’تم سائنس کے آدمی ہو، ادب سے واسطہ کیوں رکھتے ہو؟ ہاں گاہے گاہے افسانہ لکھو، لیکن پڑھائی کی جانب زیادہ دھیان دو، ورنہ نہ تم گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے۔‘‘

اکرام الدین فرحت کی باتیں حقیقت پر مبنی تھیں، لیکن میں کیا کرتا، ادب کا جراثیم میرے رگ و ریشہ میں ایسا پیوست ہو چکا تھا کہ اس سے چھٹکارا پانا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا، پھر چند دنوں کے بعد علی حیدر ملک کے پاس آ کر بی۔این کالج میں بی۔ایس سی میں داخلہ لے لیا اور اسی جگہ رہنے لگا۔ اب حسب معمول روزانہ ’’رحمانیہ ہوٹل‘‘ میں یاران ادب سے ملاقاتیں اور ادبی باتیں ہوتی رہتیں، لیکن ظفر اوگانوی کہیں نظر نہیں آئے تو میں علی حیدر ملک سے پوچھ بیٹھا:

’’ظفر اوگانوی کو چند ہفتوں سے نہیں دیکھ رہا ہوں، وجہ؟‘‘

’’ارے بھائی وہ اپنے گاؤں اوگاواں گئے ہوئے ہیں، آج کل میں آ جائیں گے۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟‘‘

’’نہیں......!‘‘

میں مختصر جواب دے کر خاموش ہو گیا۔ ہم سب یاران ادب شام کو

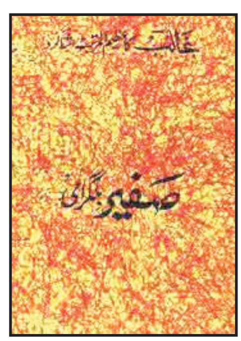

’’رحمانیہ ہوٹل‘‘ میں بیٹھ کر ماہنامہ ’’سنگم‘‘ (لداخ) سے متعلق باتیں کرنے لگے۔ زیر نظر شمارہ میں اچھے فن کاروں کی تخلیقات یکجا تھیں۔ اسی شمارہ میں سہیل عظیم آبادی کی ایک کہانی شریک تھی۔ اس کہانی سے متعلق نورالہدیٰ نے کہا:

’’سہیل صاحب آج بھی پریم چند کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ پریم چند کی کہانیوں سے سہیل صاحب حد درجہ متاثر نظر آتے ہیں، معلوم نہیں کیوں......؟‘‘

علی حیدر ملک نے دوٹوک جواب دیتے ہوئے کہا:

’’نورالہدیٰ صاحب! یہ بہت بڑی بات ہے کہ ہمارے بہار میں بھی ایک پریم چند ہیں، جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔‘‘

نورالہدیٰ نے اس جملے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس درمیان ظہیر صدیقی ہوٹل میں داخل ہوئے اور ہم لوگوں کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور کہا:

’’ارے بھائی ظفر اوگانوی کب آئیں گے کچھ پتہ بھی ہے؟‘‘

نسیم مظفر پوری نے کہا:

’’آج ہی انہیں آنا چاہئے۔‘‘

اسی درمیان ارمان نجمی کے ساتھ ظفر اوگانوی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ سب ہی اٹھ کر ظفر صاحب سے گلے ملے اور پھر ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ظہیر صدیقی نے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے پوچھا:

’’کیا بات ہے گاؤں میں اتنے دن رہ گئے؟‘‘

’’کوئی خاص بات نہیں۔‘‘ یہ کہہ کر ظفر صاحب خاموش ہو گئے اور نورالہدیٰ کے ہاتھوں سے ماہنامہ ’’سنگم‘‘ لے کر ورق گردانی کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ظفر صاحب نے ظہیر صدیقی سے کہا:

’’بھئی ’سنگم‘ میں بڑے اچھے فن کار نظر آتے ہیں، شعری و نثری تخلیقات کافی معیاری ہیں اس رسالے میں یاران ادب کی بھی تخلیقات شائع ہونی چاہئے۔‘‘

یہ سن کر سب یاران ادب نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:

’’یقیناً......‘‘

اسی وقت ’’بک امپوریم‘‘ والے حمید بھائی ’’اوراق‘‘ (پاکستان) کا تازہ شمارہ لے کر یاران ادب کی محفل میں وارد ہوئے۔ ’’اوراق‘‘ میں رشید امجد کی بڑی اچھی کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی پر ظفر اوگانوی نے اپنا ریمارکس دیتے ہوئے کہا:

''اس کہانی کی تکنیک میں اشاریت کی اجتہادی شان جھلکتی ہے، گرچہ علامتی ابہام بھی اس میں نمایاں ہے، لیکن اس میں ماجرا کی ترتیب چابک دستی کے ساتھ استعمال کی گئی ہے جس کے سبب افسانویت کی ایک فسوں انگیز فضا پیدا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے قاری کا ذہن موضوع کے تجسس میں کھو جاتا ہے۔ یہ کہانی اچھی اور معیاری ہے۔'' یہ کہہ کر ظفر صاحب خاموش ہوگئے۔نسیم مظفر پوری نے کہا:

''اس رسالے میں منظومات کے حصے بھی دعوت فکر دیتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔''

شبنم یزدانی نے ہاں میں ہاں ملایا اور خاموش ہو گئے۔ اسی درمیان چائے آگئی اور ہم سب چائے کی چسکی لینے لگے، پھر مختلف ادبی رسالوں سے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ہفتہ وار ''مورچہ'' کا بھی ذکر آیا اور اس کے معیار سے سب یاران ادب مطمئن نظر آئے۔ تھوڑی دیر بعد غلام رسول، ہوٹل مالک نے ہم سب کے نزدیک پہنچ کر کہا:

''ارے بھائی کچھ میرے بارے میں بھی لکھو۔''

''ہاں، ہاں چچا آپ کی شخصیت پر شبنم یزدانی قلم اٹھا چکے ہیں، دیکھئے وہ کب مکمل کرتے ہیں؟''

یہ کہہ کر طارق ندیم استھانوی خاموش ہوگئے۔ بہت دیر سے ارمان نجمی خاموشی کے ساتھ سب کی باتیں بغور سن رہے تھے۔ یک بیک وہ پھٹ پڑے اور کہا:

''ارے بھائی تم لوگ اب تک یوں ہی گفتگو کر رہے ہو، کوئی نئی تخلیق ہم یاران ادب کے سامنے پیش کرو تاکہ اس تخلیق پر تنقیدی و توصیفی باتیں ہوسکیں۔''

ارمان نجمی کی باتوں کو کسی نے بھی سنجیدگی سے نہیں لیا اور وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ''رحمانیہ ہوٹل'' سے سیدھے سبزی باغ روڈ پر آکر سب ہی اپنے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ ہم چاروں (علی حیدر ملک، نورالہدیٰ، ظفر اوگانوی اور راقم الحروف) بھی رمنہ روڈ کی جانب چل پڑے۔ ''پیلی کوٹھی'' پہنچنے کے بعد میں ظفر اوگانوی کے ساتھ ان کے کمرے میں چلا گیا۔ ظفر اوگانوی کپڑے تبدیل کرکے رسالہ ''اوراق'' کی ورق گردانی کرنے لگے۔ اسی درمیان میں نے ان سے دریافت کیا:

''ظفر صاحب آپ کہانی کب سے لکھ رہے ہیں؟''

''ارے بھائی! میں پندرہ سال کی عمر سے کہانیاں لکھ رہا ہوں، جو کئی اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہوئیں، لیکن میں ان سب کو اپنی معیاری تخلیقات میں شامل نہیں کرتا ہوں۔ ہاں ایک کہانی 'فردوسی چھولے' کے عنوان سے تحریر کی تھی جو ماہنامہ 'صنم' (پٹنہ) جولائی ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ شاید آپ کی نظر سے یہ کہانی گزری ہوگی؟''

''ہاں، ہاں ظفر صاحب یہ کہانی میں نے پڑھی ہے۔ اس کہانی میں عنوان سے اجنبیت جھلکتی ہے، لیکن یہ کہانی بہت ہی معیاری و خوبصورت ہے۔ یہ راجستھان، کشمیر ثانی سے تعلق رکھتی ہے۔''

''ہاں! نثار صاحب آپ نے بالکل صحیح کہا۔ میں اس وقت اپنے گاؤں اوگاواں (بہار شریف) میں تھا۔''

''ویسے ظفر صاحب آپ کی کہانیاں معاشرے کے ہر طبقے کے فرد کی نفسیاتی تحلیل پر مبنی ہوتی ہیں اور بڑی خوبصورتی سے اس کی خوشیوں، نفرتوں، لغزشوں، خواہشوں اور اندرونی شکست و ریخت کو اجاگر کرتی ہیں، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ کو افسانوی فن پر خاصا عبور ہے۔ میں نے آپ کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں۔ آپ کے افسانوں کا مواد اپنا اظہار خود ہی تراش لیتا ہے۔ کیا میں نے سچ کہا؟ یا......''

''نہیں نثار صاحب یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ میرے افسانے آپ کو پسند آتے ہیں۔''

ظفر صاحب یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اسی وقت علی حیدر ملک نے مجھے آواز دی۔ میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر علی حیدر ملک کے کمرے میں چلا گیا اور پھر علی حیدر ملک سے چند ذاتی باتیں ہونے لگیں، پتہ نہیں کب نیند کی دیوی نے ہم دونوں کو آدبوچا۔

دوسرے دن صبح تیار ہوکر جب رمنہ روڈ سے اشوک راج پتھ پر آیا تو رضا نقوی واہیؔ، علی حیدر ملک، وفاؔ ملک پوری، معصوم شرفی اسیرؔ اور ایک نئے شخص کو حسب معمول چائے کی دکان پر بیٹھے دیکھا۔ رضا نقوی واہیؔ نے مجھے آواز دی، میں ان کے نزدیک جا پہنچا۔ انہوں نے چائے پیش کرتے ہوئے کہا:

''نثار صدیقی، کیا ان صاحب کو پہچانتے ہیں؟'' میں نے

اس اجنبی شخص کو بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا:

''نہیں......میں انہیں نہیں جانتا''

''اچھا اچھا'' رضا نقوی واہی نے تعارف کراتے ہوئے کہا:

''پروفیسر عطاالرحمٰن عطاؔ کاکوی صاحب استاد شاعر۔''

میں نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

''ہاں، ہاں میں ان کی کئی تخلیقات ''اشارہ''، ''صنم''، ''صبح نو''، ''شاعر'' وغیرہ رسائل میں پڑھ چکا ہوں۔اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے استاد شاعر سے ملوایا۔'' پھر چائے کی چسکی کے درمیان مندرجہ بالا حضرات سے ذاتی وادبی باتیں ہوتی رہیں اور پھر کچھ دیر بعد معذرت کے ساتھ میں وہاں سے رفو چکر ہوا۔

پٹنہ کے یاران ادب کی محفل میں تقریباً تین سالوں تک وقت گزارنے کے بعد پٹنہ سے اپنے گھر (اورنگ آباد) چلا آیا۔۱۹۶۶ء میں جب بھر کنڈا این۔سی۔ڈی۔سی کے ماتحت ٹریننگ اسکول (ایم۔ٹی۔ایس میں تین سالہ ٹریننگ لینے کے لیے داخلہ لیا تو اس وقت مجھے نسیم مظفر پوری سے معلوم ہوا کہ ظفر اوگانوی صاحب ماہنامہ ''اقدار'' پٹنہ سے نکال رہے ہیں جو ترقی پسندی کے مقابلے میں جدیدیت کی ترویج کے لیے ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی، اس کے بعد میں نامساعد حالات سے گزرتا رہا۔پٹنہ کے یاران ادب سے دن بہ دن دوریاں بڑھتی گئیں۔گاہے گاہے کسی کے ذریعے یاران ادب کے ارکان سے متعلق کچی پکی خبریں ملتی رہیں۔چند ماہ بعد یک بیک اورنگ آباد کے پتہ پر ظفر اوگانوی کا افسانوی مجموعہ ''بیچ کا ورق'' دستیاب ہوا۔اس مجموعے میں تین افسانے مجھے ازحد پسند آئے، وہ ہیں:

''قیادت''، ''انٹرمورس'' اور ''بیچ کا ورق'' ان تین افسانوں پر مکمل ایک کتاب تحریر کی جا سکتی ہے۔کئی ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ ظفر اوگانوی مغربی بنگال یونیورسیٹی میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔یہ جان کر از حد خوشی حاصل ہوئی۔ہم سب یاران ادب پٹنہ کو حالات و وقت نے بکھیر کر رکھ دیا تھا۔آج ہمارے یاران ادب میں ظہیر صدیقی، نسیم مظفر پوری اور راقم الحروف زندہ رہ گئے ہیں۔جب میں ممبئی (فلم انڈسٹری) میں تھا تو پروفیسر مناظر احسن نے فون پر بتایا کہ ظفر اوگانوی آج (۲۱جون ۱۹۹۶ء) انتقال کر گئے۔ہائے ظفر! تم کہاں چلے گئے؟ کاش......! ❀❀

اعلیٰ حضرت بریلوی

اعلیٰ حضرت بریلوی کا اصل نام احمد رضا ہے اور علمی وادبی دنیا میں وہ فاضل بریلوی کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں۔ان کی ولادت ۱۴جون ۱۸۵۶ء میں بریلی شریف میں ہوئی۔ان کے جد حقیقی کا نام مولانا رضا علی اور والد محترم کا نام علامہ نقی علی تھا۔اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں کا تاریخی نام ''المختار'' ہے۔انہوں نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ مکمل کیا اور متنوع علوم کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور ۱۸۶۹ء میں سند فراغت پا کر پہلا فتویٰ لکھا۔انہیں خانقاہ مارہرہ کے بزرگ حضرت سید آل رسول مارہروی سے ارادت اور اجازت وخلافت حاصل تھی۔

اعلیٰ حضرت بریلوی تفسیر اور حدیث وفقہ جیسے دینی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ بیشتر جدید وقدیم علوم پر بھی مثالی دسترس رکھتے تھے۔متعدد کتابوں میں ذکر ہے کہ وہ پچاس سے زیادہ علوم وفنون میں یگانہ روزگار تھے۔معاشیات واقتصادیات میں ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' نامی رسالہ کے علاوہ ''فتاویٰ رضویہ'' ان کی معروف زمانہ یادگار ہے جو متعدد ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔''کنزالایمان'' کے نام سے ان کا اردو ترجمہ قرآن بھی متداول ومشہور ہے اور اُن کا نعتیہ دیوان ''حدائق بخشش'' اور نعت پاک ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' بھی معروف عام ہے۔ان کی وفات ۲۸/اکتوبر ۱۹۲۱ء کو بریلی شریف میں ہوئی۔محکمہ ڈاک وتار نے قبر رضا کی تصویر کے ساتھ ۱۹۹۵ء میں ان پر یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا تھا۔

انجینئر فیروز مظفر
Gen. Secretary Muzaffar Hanfi Memorial Society, D-40, Batla House,
Muzaffar Hanfi Lane, Jamia Nagar, New Delhi-110025 (Mob.9310365373)

مظفر حنفی کی کہانی میری زبانی

مظفر حنفی نے اپنے ادبی سفر کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے:

''ایک دفعہ والد صاحب نے رات کو گیارہ بجے 'طلسم ہوش ربا' پڑھتے ہوئے دیکھ کر مجھے خاصا طویل لیکچر پلایا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ مجھے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہئے تا کہ آگے چل کر اس لائق ہو جاؤں کہ دوسروں کی کتابیں پڑھنے کی جگہ خود دوسروں کے لیے کتابیں لکھ سکوں۔ ناپختہ ذہن پر اس بات کا الٹا اثر ہوا اور میں فی الفور دوسرے کے لئے لکھنے پر تل گیا۔ بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں، بڑوں کے لیے افسانے (کہانیاں) دھڑا دھڑ ڈھلنے لگے۔ 'کھلونا'، 'شمع'، 'نکہت'، 'بیسویں صدی' اور اس طرح کے دوسرے رسالوں میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔''

پروفیسر مظفر حنفی کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو کھنڈوہ میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم کھنڈوا اور ہسوہ (فتح پور، یو پی) میں ہوئی۔ اقتصادی مسائل کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور ہائی اسکول کے بعد سے ہی روزگار کی تلاش میں لگ گئے۔ کچھ اقتصادی صورت حال اور قدرتی توفیق کی بنا پر وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں، نظمیں لکھنے لگے۔ انگریزی کی اچھی سمجھ ہونے کی وجہ سے جب وہ صرف انیس سال کے تھے، ان کے ''جاسوسی ناول'' جن کو انہوں نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا چھپنے لگے، مان سرور نامی ترقی پذیر ادارہ نے ان کی کہانیاں چھاپنی شروع کی۔ ۱۹۵۴ء میں بچوں کے ادب کی کتاب ''بندروں کا مشاعرہ'' نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ پانچ ناولیں بالترتیب ''چوروں کا قاتل''، ''پراسرار قتل''، ''بین الاقوامی لٹیرے''، ''پیلی کوٹھی''، نسیم بک ڈپو لکھنؤ اور مان سرور پبلی کیشن الٰہ آباد سے شائع ہوئے۔ ترجمے کے میدان میں بھی مظفر حنفی کے کام بہت اہم ہیں۔ ۱۹۵۴ء سے اپنی وفات تک ان کی پندرہ کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں جہاں ساہتیہ اکادمی کے مونوگراف ''بھارتیندو ہریش چندر'' اور ''بنکم چندر چٹرجی'' اور نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے ترجمہ کردہ کتابوں میں ''اڑیا افسانے''، ''گجراتی کے یک بابی ڈرامے'' اور ''بیداری'' جیسی کتابیں ہیں، وہیں پرائیوٹ پبلشر نیشنل اکادمی دہلی کے لیے ''سخاروف نے کہا'' اور الیکزنڈر اسٹولین کی کتاب ''گلاگ مجمع الجزائر'' کے تین باب شائع ہوئے۔ انہوں نے بھارتی بھاشا پریشد کلکتہ کے لیے ''شریشٹھ ایکانکی'' ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا۔

بچوں کے ادب پر ۱۹۵۴ء میں شائع کتاب ''بندروں کا مشاعرہ'' کے بعد ۱۹۸۲ء میں ''نیلا ہیرا''، ۲۰۰۴ء میں ''کھیل کھیل میں''، ۲۰۰۷ء میں ''چٹخارے''، ''نرسری کے گیت''، بچوں کے لیے ''حلوہ چور'' اور ۲۰۱۸ء میں ''بول میری مینا'' جیسی کتابیں آئیں۔ NCPUL نے ۲۰۱۹ء میں نرسری رائمس کی کتاب ''چندا ماموں'' کے نام سے شائع کیا۔ ترجمہ اور بچوں کے ادب سے شروع ہونے والے اس ادیب نے اپنے دوسرے افسانوں کے مجموعے ''دوغنڈے'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک میں بڑی تیزی کے ساتھ افسانے ہی لکھتا رہا ہوں۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز گیارہ سال کی عمر میں (۱۹۴۷ء کے آس پاس) کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء تک بچوں کے لیے لکھتا رہا ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۰ء تک افسانہ نگاری کی۔''

مظفر حنفی ۱۹۵۵ء میں فتح پور سے بھوپال چلے گئے اور مدھیہ پردیش کے

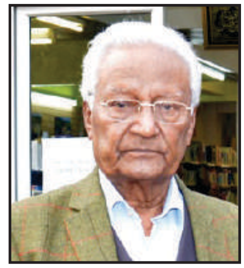

تعلیمی محکمے میں استاد مقرر ہو گئے۔ رائے سین ضلع کے لاڈ کوئی گاؤں میں دو سال تک ملازمت کرنے کے بعد کان پور میں ایرفورس میں نوکری کی تلاش اور ٹیوشن وغیرہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں اپنی جائے پیدائش کھنڈوہ سے اردو کا ماہانہ رسالہ ''نئے چراغ'' نکالنا شروع کیا۔ کھنڈوہ میں اردو اسکول، نیشنل لائبریری اور آس پاس میں اردو اسکول کھولنے کے لیے جدو جہد کرتے رہے۔ ۱۹۵۹ء تک ''نئے چراغ'' ایک مشہور رسالہ بن چکا تھا جسے آج بھی جدید اردو ادب کا پہلا رسالہ کہا جاتا ہے۔ ''نئے چراغ'' کے اٹھارہ شمارے شائع ہو جانے کے بعد مظفر حنفی ایک بار پھر کھنڈوہ سے ہجرت کر کے اپنے وطن خاص کی رہائش گاہ ہسوہ، فتح پور چلے گئے جہاں نومبر ۱۹۵۹ء میں ان کی شادی کڑا مانک پور الہ آباد کے مشہور سید خاندان کی عاصمہ خاتون سے ہوگئی۔

اقتصادی اور خاندانی مسائل کی وجہ سے مظفر حنفی ایک بار پھر مدھیہ پردیش حکومت کے محکمہ جنگلات میں کلرک کی نوکری کرنے لگے۔ اسی ملازمت کے دوران مظفر حنفی کی کہانیوں کے مجموعے ''اینٹ کا جواب'' اور ''دیدۂ حیراں'' شائع ہوئے۔ افسانے کے ساتھ ساتھ مظفر حنفی شاعری بھی کرنے لگے تھے اور ''نئے چراغ'' کی ادارت کرتے وقت شاؔد عارفی سے متاثر ہو کر ان سے شاعری پر مشورے بھی کیا کرتے تھے اور بعد میں ان کی شاگردی بھی اختیار کر لی تھی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے کہانیاں لکھنا ترک کر دیا، حالاں کہ اس وقت تک وہ ایک مشہور کہانی کار مانے جانے لگے تھے۔

مظفر حنفی نے سب سے پہلا افسانہ ''منت کی چادریں'' ۱۹۵۰ء میں لکھا۔ تین کہانیوں کے مجموعے ''دو غنڈے''، ''دیدۂ حیراں'' اور ''اینٹ کا جواب'' شائع ہو کر مشہور ہوئے جنھیں میں نے ۲۰۱۴ء میں جمع کر کے ''بھولی بسری کہانیاں'' کے نام سے NCPUL کی مالی امداد سے شائع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مظفر حنفی کی متعدد کہانیاں مختلف رسالوں میں بکھری پڑی ہیں اور میری کوشش ہے کہ ان کو بھی ترتیب دے کر اردو میں شائع کراؤں۔

افسانہ نگاری سے نکل کر مظفر حنفی شاعری کی طرف ایسے چلے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انہیں جدید اردو غزل کا Trend Setter لکھا ہے۔ مشہور ترقی پسند شاعر اختر سعید خاں نے بھوپال میں ایک جلسے میں کہا تھا کہ اب اردو غزل کو مظفر حنفی کی غزل کے پیچھے چلنا پڑے گا۔ مظفر حنفی کا یہ سفر اقتصادی اور ادبی دونوں اعتبار سے سنہرا سفر کہا جائے گا کیوں کہ محکمہ جنگلات کی نوکری کے دوران ہی مظفر حنفی نے علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے بی۔اے کیا اور جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب کامل کا کورس بھی۔ اسی ملازمت کے دوران ۱۹۶۸ء میں سیہور ڈگری کالج سے انہوں نے ایل، ایل، بی بھی کیا اور سیفیہ کالج بھوپال سے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم۔اے اردو میں اول مقام حاصل کیا۔

شاؔد عارفی کے فن سے وہ اس طرح متاثر تھے کہ شاؔد عارفی کی وفات کے بعد ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک ان پر کئی کتابیں لکھ کر شائع کرا چکے تھے۔ مظفر حنفی کی کتاب ''ایک تھا شاعر''، علی گڑھ مسلم اسکول کے کورس میں پڑھائی جاتی تھی، حالاں کہ اس وقت تک مظفر حنفی کے پاس صرف بی۔اے کی ڈگری تھی۔ شاؔد عارفی کو جدید اردو غزل کا ایک بڑا شاعر منوانے کے لئے مظفر حنفی نے جو سفر ۱۹۶۷ء سے شروع کیا وہ ان کی وفات ۲۰۲۰ء تک جاری رہا۔ اس دوران مظفر حنفی نے شاؔد عارفی کو اردو ادب میں ان کا مقام ہی نہیں دلایا بلکہ استاد اور شاگرد کی ایک نئی روایت بھی قائم کی۔ ۱۹۶۷ء میں پہلی کتاب ''ایک تھا شاعر'' ۱۹۶۸ء میں ''نثر و غزل دستہ''، ۱۹۶۹ء میں ''شوخیٔ تحریر''، ۱۹۷۰ء میں ''شاؔد عارفی کی غزلیں'' ۱۹۷۴ء میں ''کلیاتِ شاؔد عارفی'' ۱۹۷۶ء میں ''شاؔد عارفی: شخصیت اور فن''، ۱۹۹۳ء میں ''شاؔد عارفی: ایک مطالعہ'' ۲۰۰۱ء میں ''شاؔد عارفی: فن اور فن کار'' ۲۰۱۵ء میں ''منتخبات شاؔد عارفی'' ۲۰۱۶ء میں مکاتیب و مضامین ''شاؔد عارفی (مونوگرام) ۲۰۱۸ء میں ''کلیات شاؔد عارفی'' کو دوبارہ شائع کر کے شاؔد عارفی کو اردو میں ایک مقام عطا کیا۔

مظفر حنفی، شاؔد عارفی کے فن سے ''نئے چراغ'' کے وقت سے متاثر ہوئے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء تک شاؔد عارفی سے اپنی منظوم کاوشوں پر اصلاح لی اور شاگردی اختیار کی۔ یہ شاگردی صرف خط و کتابت پر مبنی تھی اور مظفر حنفی نے شاؔد عارفی کی وفات کے بعد

ان پر پندرہ سولہ کتابیں لکھیں، جب کہ شاؔد عارفی کی زندگی میں ان کی ایک بھی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔۱۹۷۱ء میں سیفیہ کالج بھوپال میں ''شاؔد عارفی شخصیت اور فن'' پر تحقیق کرنے کے لیے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے ماتحت رجسٹریشن کرایا۔ اس وقت مظفر حنفی عالمی شہرت یافتہ شاعر اور قلم کار ہو چکے تھے اور ان کے گائڈ پروفیسر عبدالقوی دسنوی اس قدر مشہور نہ تھے۔ مظفر حنفی کی وجہ سے ہی عبدالقوی دسنوی کو نئی پہچان ملی، لیکن مظفر حنفی نے یہاں بھی استاد شاگرد کی روایت کو بلندی تک پہنچا دیا اور لوگ ان کی آج اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ استاد کی کس طرح عزت کی جاتی ہے، یہ کوئی مظفر حنفی سے سیکھے۔

۱۹۷۳ء میں ڈاکٹریٹ کی سند لینے کے بعد مظفر حنفی سیہور سے دہلی آ گئے اور دہلی کی C.E.R.T. میں پروڈکشن اسسٹنٹ کی نوکری حاصل کی۔۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک پروڈکشن اسسٹنٹ کا کام انجام دینے کے بعد فروری ۱۹۷۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اردو ڈپارٹمنٹ میں لیکچرار بحال ہو گئے۔ جامعہ کا اردو ڈپارٹمنٹ اس وقت مظفر حنفی اور گوپی چند نارنگ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہاں مظفر حنفی نے گوپی چند نارنگ کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کے ایک بڑے پروجیکٹ ''وضاحتی کتابیات'' کی شروعات کی، جس کے تحت ۱۹۷۶ء میں ہندوستان میں شائع ہونے والی سبھی کتابوں کے تعارف پر مبنی کتاب ''وضاحتی کتابیات'' (حصہ اول) ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اسی سلسلے کی دو کتابیں ''وضاحتی کتابیات'' (حصہ دوم اور سوم) ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئیں۔ وضاحتی کتابیات کے اہم پروجیکٹ کو مظفر حنفی نے ۱۹۹۹ء تک کی مطبوعات کا کام تنہا مکمل کر کے ۲۰۰۱ء میں NCPUL سے شائع کرایا۔ اردو کا یہ بڑا پروجیکٹ ایک بہت اہم کام تھا اس سلسلے کو NCPUL کو ۲۰۰۰ء کی مطبوعات کے ساتھ پھر سے شروع کرنا چاہئے۔

''وضاحتی کتابیات'' کا سلسلہ تین جلدوں کے بعد دیگر وجوہات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ مظفر حنفی کلکتہ یونیوسیٹی کی ''اقبال چیئر'' پروفیسر کی حیثیت سے کلکتہ چلے گئے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ دہلی یونیورسیٹی۔ اس دوران ان دونوں کے درمیان کچھ اختلاف ہو گئے تھے۔

بہر حال مظفر حنفی ادب اطفال، ترجمہ نگاری اور افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کے سفر کو شروع کرتے کرتے ۱۹۶۰ء سے کچھ پہلے شاعری کی طرف ایسے چلے کہ اردو شاعری کی دنیا میں ان کے منفرد انداز اسلوب کا ڈنکا بجنے لگا۔ وہ جدید اردو غزل کے منفرد اور اہم شاعر کہے جانے لگے، حقیقت بھی یہی ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو محبت اور عشق سے اٹھا کر ایک نئے لہجے سے آشنا کیا۔ انہوں نے اردو غزل کو عام لوگوں کے مسائل، سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں، برے رسم و رواج اور نا انصافی کو غزل کے توسط سے اجاگر ہی نہیں کیا بلکہ سماج کے غریبوں، مظلوموں اور اقلیتوں کی آواز کو حکومت تک پہنچایا، لیکن غزل کے اعلیٰ ادبی احترام کے ساتھ۔ مظفر حنفی کا شعر ہے ۔

ہمارے دور میں آ کر مظفؔر
غزل ہندوستانی ہو رہی ہے

ورنہ سستی اور بازاری شاعری تو اسٹیج سے بشیر بدؔر، شہر یاؔر، ندؔا فاضلی بھی کر رہے تھے، جس میں غیر حقیقی اور خیالی اور عام لوگوں کی پسند کو دھیان میں رکھا جا رہا تھا۔ مظفر حنفی کی شاعری کا یہ سفر ۱۹۶۷ء میں شائع تصنیف ''پانی کی زبان'' سے شروع ہوا اور تیز رفتار سے ۱۹۶۹ء میں ''عکس ریز''، ۱۹۷۰ء میں ''تیکھی غزلیں''، ۱۹۷۱ء میں ''صریر خامہ'' ۱۹۷۴ء میں ''دیپک راگ'' ۱۹۸۰ء میں ''طلسم حرف'' اور ''یم بہ یم''، ۱۹۸۱ء میں ''کھل جا سم سم''، ۱۹۸۶ء میں ''پردہ سخن کا'' ۱۹۹۹ء میں ''یا اخی''، ۲۰۰۱ء میں ''ہاتھ اوپر کئے'' اور ۲۰۰۴ء میں ''آگ مصروف ہے'' تک چلا، یہاں تک کہ ان کو میر تقی میؔر کے بعد سب سے زیادہ غزلیں کہنے والا شاعر بھی کہا گیا۔ مظفر حنفی کی غزلوں کے انتخابات کے مجموعے ''پرچم''، ''گردباد'' اور ''چنیدہ'' ۲۰۱۴ء میں چھپے۔ اس کے علاوہ ان کی تمام شعری تخلیقات ۲۰۱۳ء میں کلیات کی شکل میں دو حصوں میں ''کمان'' اور ''تیزاب میں تیرتے پھول'' کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ان کے کچھ مشہور اشعار کا مجموعہ ''ہیرے ایک ڈال کے'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی غزلوں، نظموں کا گجراتی، مراٹھی، پنجابی، ترکی اور انگریزی میں ترجمہ بھی کیا گیا، پاکستان کے بریگیڈیر خواجہ طارق محمود نے بہت سی غزلوں کا انگلش ترجمہ عجیب و غریب انداز میں کیا جو Salected Ghazal کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ہندی میں بھی ان کے منظوم

مجموعے ''مظفر کی غزلیں''، ''مرچ غزل پر''،''غزل دستہ''،''غزل جھرنا''،''غزل دھارا''اور''غزل دریچہ''چھپ کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

مظفر حنفی کی شاعری جتنی گہری اور اہم ہے اس لحاظ سے ان کو جو شہرت اور انعام ملنا چاہئے تھا وہ نہیں ملا جس کی بہت سی وجوہات ہیں اور شاعر کو بھی اس بات کا احساس تھا ؎

میرؔ کا جیون روتے روتے بیتا اس نگری میں
دلی میں سمان مظفرؔ ہوتا خاک ہمارا

مظفر حنفی کو جو عزت اور انعام ملنا چاہئے تھا، وہ نہیں ملا اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مظفر حنفی نہ صرف حقیقی شاعر تھے بلکہ اپنے فن اور طرز تحریر پر یقین رکھتے تھے اور دوسرے یہ ہے کہ وہ جگاڑ بازی، پینترے بازی، پی آر شپ سے دور رہ کر لکھتے تھے۔ مظفر حنفی کی تحریر سچ اور صرف سچ پر مبنی ہوتی تھی۔ جب ہی تو وہ لکھتے ہیں:

''نارنگ ایک اچھے مقرر اور ناظم اعلیٰ ہیں، لیکن مہادیوی ورما ان سے بہت بڑی مصنفہ ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو غزل کی طرف ابھی محنت کی ضرورت ہے۔ وہ قلم کار اچھے ہیں شاعر نہیں۔ بشیر بدرؔ شاعر چاکلیٹی ہیں۔

کلکتہ میں ایک کتاب کی رسم اجرا کے پروگرام میں کسی نے ایک شاعر کے بارے میں کہا کہ ان کے تین سو شاگرد ہیں تو مظفر حنفی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ان صاحب کو جن کے تین سو شاگرد ہیں انہیں ابھی ایک اچھے استاد کی ضرورت ہے۔

مجروحؔ سلطان پوری کے ساتھ ساتھ مظفر حنفی نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی غلط بیانی کی طرف ''کتاب نما'' میں کھل کر لکھا۔ اپنی تحریروں اور تقریروں سے وہ ادب میں ہو رہی دھاندلی کو اجاگر کرتے رہے اور جلسے اور سمیناروں میں بھی انہوں نے ان سب غلط باتوں پر کھل کر احتجاج کیا، ساتھ ہی ان سب کو ڈانٹتے ڈپٹتے بھی رہے۔ مشاعرے کے اسٹیج پر بشیر بدرؔ، شہر یارؔ، ندؔا فاضلی، منورؔ رانا اور راحتؔ اندوری کو ڈانٹا پھٹکارا تو سمیناروں میں پروفیسر نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، عنوان چشتی، ظفر اوگانوی، نازؔ قادری، مناظر عاشق ہرگانوی، محبوب راہی، اعجاز افضل کو ان کے سامنے ان کی غلطیاں بتا کر صحیح کرنے کو کہا۔

ظاہر ہے یہ سب لوگ ہی ادب کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، کوئی صوبائی تو کوئی مرکزی، سو نقصان تو ہونا ہی تھا، لیکن وہ مظفر حنفی ہی کیا جو ان سب باتوں سے لچک جائیں، جھک جائیں ؎

میں اہل اقتدار سے جھک کر نہیں ملا
تسلیم ان سبھی نے کیا تب کہ ہے کوئی

اک زمانہ ہے مظفرؔ کے خلاف
نہ سمجھتا ہے نہ لچکتا ہے کچھ

تنقیدی مضامین اور مختلف سیمیناروں اور کالج و یونیورسیٹیوں میں لیکچرر اور ادبی تقریر اور ریڈیو کے لئے لکھی گئی تحریریں اور فیچر کے ساتھ مظفر حنفی کی جو کتابیں شائع ہوئیں وہ بالترتیب اس طرح ہیں: ۱۹۷۶ء میں ''نقد ریزے''، ۱۹۸۲ء میں ''جہات و جستجو''، ۱۹۸۷ میں ''تنقیدی ابعاد'' ۱۹۹۲ء میں ''ادبی فیچر اور تقریریں''، ۱۹۹۴ء میں ''باتیں ادب کی'' ۲۰۰۱ء میں لاگ لپیٹ کے بغیر'' ۲۰۰۷ء میں کچھ اہم مضامین کا مجموعہ ''ہندوستان اردو میں'' (جس کا ہندی ترجمہ بھی ۲۰۲۳ء شائع ہو چکا ہے اور اس کتاب کا انگلش ترجمہ فراز عارف اکولہ کر رہے ہیں) ۲۰۱۰ء میں ''مضامین تازہ'' ۲۰۱۴ء میں اہم تحریروں کا ایک مجموعہ میں نے ''تنقیدی نگارشات'' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کرایا۔

مذکورہ تحریروں کے علاوہ مظفر حنفی نے وقت وقت پر مختلف اداروں کے لیے اپنے محبوب موضوع پر مونوگراف بھی لکھے جو مقبول عام بھی ہوئے اور ادب میں ان لوگوں کو مستحکم کرنے کی وجہ بھی بنے۔ ایسے ہی مونوگراف میں نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے ۱۹۹۱ء میں ''حسرتؔ موہانی'' دہلی اردو اکادمی کے لیے ''کلیات میر حسنؔ'' ساہتیہ اکادمی کے لیے ۱۹۹۶ء میں ''محمد حسین آزاد'' اور ۲۰۱۰ء میں دہلی اردو اکادمی کے لیے ''میر تقی میرؔ'' پر مونوگراف لکھا۔ ۲۰۱۶ء میں NCPUL کے لئے ''شادؔ عارفی'' پر اور ۲۰۱۷ء میں اتر پردیش اردو اکادمی کے لئے ''سالکؔ لکھنوی'' پر مونوگراف لکھا۔

بچوں کے ادیب، ترجمہ نگار، افسانہ نگار مشہور شاعر اور قلمکار کے طور پر ہی مظفر حنفی کا قلم نہیں رکا بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ادارت کا کام

بھی کرتے رہے۔۱۹۵۸ء میں ''نئے چراغ'' کی ادارت سے یہ سفر شروع ہوا۔اس عجیب وغریب اور مستحکم قلم کار نے جہاں ''شاد عارفی'' پر پندرہ کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کروائیں، وہیں یونیورسیٹی کے طلبہ کے لیے ۱۹۸۵ء میں ''جدیدیت، تجزیہ اور تفہیم'' جیسی قیمتی کتاب تو ۱۹۸۷ء میں دہلی اردو اکادمی کے لیے ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز ومزاح'' ایڈٹ کی۔سر تیج بہادر سپرو کی تنظیم ''انجمن روح ادب، الٰہ آباد'' کی سلور جبلی کے موقع پر اردو غزل کا سب سے بڑا انتخاب ''روح غزل'' کے نام سے ترتیب دیا جس میں ۱۹۴۷ء سے آج تک کے سبھی مشہور شاعروں کی غزلیں منتخب کر کے ترتیب دی۔۱۹۹۳ء میں شائع ''روح غزل'' میں ۶۹۳ شاعروں کی تین تین غزلیں ہیں۔اس کتاب کو اردو غزل کا سب سے اہم انتخاب کا مجموعہ مانا جاتا ہے۔اس سے جہاں اردو ادب کو ایک اہم کتاب فراہم ہوئی، وہیں مظفر حنفی کو بہت نقصان بھی ہوا۔ظاہر ہے کہ مذکورہ کتاب میں جو شاعر، پروفیسر، مدیر شامل نہیں ہو سکے، وہ مظفر حنفی کے خلاف ہو گئے اور مختلف طرح سے ان کو نقصان پہنچاتے رہے۔

ساغر نظامی کو بھی اردو ادب نے بھلا دیا تو مظفر حنفی نے ان کی شعری مجموعہ کو تین حصوں میں ''کلیات ساغر نظامی'' کے نام سے شائع کر کے آج کے قارئین کے سامنے رکھا۔ بھارتیہ بھاشا پریشد کلکتہ نے جب اپنی کتاب ''شریسٹھ ایکانکی'' کی ادارت شروع کی تو مظفر حنفی سے اردو ادب کے ڈرامے کا انتخاب اور ترجمہ کروایا۔اس طرح سے مظفر حنفی ایک بہترین مدیر بھی ثابت ہوئے جو بیباک، سچ اور ادب پر گہری نظر رکھنے والے اور مقبول عام شخص بھی تھے۔

ان سب خاصیتوں کے ساتھ ساتھ مظفر حنفی کو سیر وتفریح کا شوق بچپن سے ہی تھا، چنانچہ یونیورسیٹی کی نوکری اور شاعری کے اسٹیجوں کے توسط سے ملکی وغیر ملکی اسفار کا موقع ملا۔ان کے بیٹے پرویز مظفر کے یو۔کے میں رہنے کی وجہ سے بھی مظفر حنفی کو بار بار بیرون ملک جانے کی سہولت مہیا ہوئی۔اس سفر کی روداد کو بھی انہوں نے اپنے سفر نامے ''چل چنبیلی باغ میں'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں لکھا جسے مقبول عام کہا جاتا ہے۔مظفر حنفی وقت وقت پر اپنے انٹرویوز اور زندگی کے تعلق سے مختلف دلچسپ سلسلہ وار تحریریں بھی اخباروں کے کالم کے لیے لکھتے تھے جن میں ''حاضر جوابیاں'' ہر ہفتے ''انقلاب'' اخبار میں چھپتا تھا، اسی طرح کلکتہ کے اخبار ''آبشار'' میں بھی ان کی طویل نظم ''عکس ریز'' لگاتار ''آیئے آپ کو اس دور کی جھلکیاں دکھاؤں'' کے عنوان سے روزانہ شائع ہوتی تھیں۔انٹرویوز کی تین کتابیں بھی مظفر حنفی کے خاص طرز اور فن کی بہترین کتابیں ہیں۔پہلی کتاب ''سوالوں کے حصار میں'' دوسری ''گفتگو دوبدو'' اور تیسری کتاب ہے ''کچھ انٹرویوز'' جو ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی۔

مظفر حنفی کو جہاں بڑے سرکاری انعامات سے محروم رکھا گیا، وہیں ادبی میدان میں ان کے خدمات کی نہ صرف قدر کی گئی بلکہ ان کو سچا بڑا شاعر مانا گیا اور بہت سے انعامات کے ساتھ ان پر سیمینار، رسالوں کے خصوصی شمارے اور یونیورسیٹیوں میں تحقیق کے کام ہوئے۔ہندوستان اور پاکستان میں وہ پہلے باحیات قلم کار تھے جن پر سب سے پہلے بہت اہم تحقیقی کام ڈاکٹر محبوب راہی نے کیا اور ناگپور یونیورسیٹی سے ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد ۲۰۲۲ء میں حیدرآباد یونیورسیٹی سے محمد خوشتر نے تحقیق کا کام کیا۔۲۰۲۲ء میں ہی تمنا نسیم نے وشو بھارتی یونیورسیٹی کلکتہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔میری جانکاری کے مطابق دہلی یونیورسیٹی میں نادر غفران، دیوی اہلیہ یونیورسیٹی میں عائشہ، رانچی یونیورسیٹی میں مبارک انصاری کے علاوہ مظفر پور یونیورسیٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی اور رانی گنج میں بھی طلبہ ان پر تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔امید کی جاتی ہے کہ اردو ادب میں مظفر حنفی کو ان کا مناسب مقام ضرور ملے گا، ویسے ہی جیسے ان کو شاعری میں بھارت کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے اور سبھی شاعران کی اتباع کرنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

رسالوں کے خاص شماروں اور گوشوں کے علاوہ مظفر حنفی کی تحریروں اور ادب پر کئی کتابیں لکھی گئیں جو اس طرح ہیں۔۱۹۸۷ء میں ''مظفر حنفی حیات، شخصیت اور کارنامے'' (ڈاکٹر محبوب راہی) ۱۹۹۹ء میں ''مظفر حنفی ایک مطالعہ'' ۲۰۰۶ء میں ''مظفر حنفی فن اور فنکار'' (نوشاد مومن) ۲۰۱۰ء میں ''مظفر حنفی بنام محبوب راہی'' ۲۰۱۴ء میں ''مظفر حنفی: حیات وجہات'' ۲۰۱۹ء میں ''مظفر حنفی: شخصیت اور فن'' (جاوید اختر) ۲۰۲۰ء میں ''انوکھا شخص اور شاعر'' ۲۰۲۱ء میں ''مظفر حنفی: فن، شخصیت اور خطوط'' (شکیل اعجاز) ۲۰۲۲ء میں ''مظفر حنفی یاا خی کی روشنی میں'' (ڈاکٹر

افضال عاقل) کے علاوہ میری مرتب کتابیں ''مظفر حنفی کے نام (ادبی خطوط کی دو جلدیں)''مظفر حنفی کے تبصرے''اور''مظفر فہمی'' شائع ہوئیں۔ ادبی دنیا میں یہ کتابیں مظفر شناسی کی قابل قدر روایت قائم کرتی ہیں۔

مظفر حنفی کی ادبی زندگی کی شروعات کھنڈوہ، فتح پور، ہسوا، سیہور سے بھوپال، دہلی اور کلکتہ تک قابل فخر رہی، انہوں نے بے حد متاثر کن، مہذب، پختہ اور مطمئن خاندان کے ساتھ دہلی میں جہاں لوگ ایک مکان کے لیے ترستے ہیں وہاں محنت سے کمائے ہوئے مال سے اپنی وفات سے پہلے سبھی بچوں کو ایک ایک مکان بنا کر دیا تا کہ وہ بھی ان کی طرح کسی کے آگے نہ جھکیں صرف اللہ کے سامنے جھکیں۔ آپسی میل ملاپ، بھائی چارے اور سادگی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنے اصولوں، مثالی نمونوں، خودداریوں، انصاف پسندیوں اور سچائی کے ساتھ کام کرتے ہوئے اردو کا یہ عظیم ادیب، کہانی کار، قلم کار، ناقد، محقق، مترجم، مدیر، اہم شاعر، ادیب اطفال کا فن کار، پروفیسر اور سب سے بڑھ کر ایک بہترین شوہر، والد، استاد، صلاح کار جسے دنیا مظفر حنفی کہتی ہے، اپنی بہترین بھرپور شخصیت کے صدہا نقوش درخشاں چھوڑ کر ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۰ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور بٹلہ ہاؤس قبرستان میں آسودۂ لحد ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ مظفر حنفی کی وفات کے بعد بہت کچھ کہا گیا، لیکن جو ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا۔ دہلی اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بنگال اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی NCPUL اور ساہتیہ اکادمی پر ابھی مظفر حنفی کا قرض باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کبھی تو وہاں اچھے لوگ آئیں گے اور مظفر حنفی کی خدمات کے اعتراف کا اہم کام ہوگا۔ مظفر حنفی کے شعر پر ہی اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

بچپن میں کھلواڑ کیا تھا اک دن ہم نے شعروں سے
بھوگ رہے ہیں پچپن برسوں سے اپنی نادانی کو

❁❁❁

ن۔م۔راشد

ن۔م۔راشد کا اصل نام نذر محمد، تاریخ پیدائش یکم اگست ۱۹۱۰ء اور جائے پیدائش گوجرانولہ، پنجاب ہے۔ ان کے والد رضا فضل الٰہی چشتی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکول کے عہدے پر فائز تھے۔ نذر محمد راشد نے گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۲۶ء میں میٹرک کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کی سند لی۔ ۱۹۳۹ء میں وہ بحیثیت نیوز ایڈیٹر ریڈیو کے محکمہ سے وابستہ ہوئے اور اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے تک ترقی کی۔ ن۔م۔راشد کی ادبی دلچسپی کا آغاز کالج کے تعلیمی دور سے ہی ہو گیا تھا۔ وہ پطرس بخاری اور ڈاکٹر تاثیر کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے۔ راشد کی اردو، انگریزی، فارسی اور ہندی کے علاوہ فرانسیسی اور روسی زبانیں بھی آتی تھیں۔ انہوں نے ایران، عراق، مصر اور سری لنکا کا سفر بھی کیا تھا۔ راشد کی کتابیں ''ماورا''، ''ایران میں اجنبی''، ''لا = انسان'' اور ''گمان کا ممکن'' وغیرہ مشہور ہیں۔ ن۔م۔راشد کو نئی شاعری کے بنیان گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید انسان کی کشمکش نمایاں ہے اور نظم میں انہوں نے ہیئت اور تکنیک کے بہت سارے تجربے کئے ہیں اور پیچیدہ وعلامتی شاعری کو فروغ دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اور طبیعت کا عمومی رجحان بہر حال زندگی کی کشمکش سے فرار کی طرف ہے۔ راشد کے

دل و دماغ پر دو طاقتیں مسلط رہی ہیں یعنی جنس اور جنسی تشنگی کی وجہ سے خواہش مرگ۔ وہ مذہب کے تصور سے بھی بیزار ہیں۔ ان کی نظم ''انتقام'' سے ان کے مذکورہ رجحان کی بخوبی عکاسی ہو جاتی ہے۔ راشد کی شاعری میں مغربی استحصال کے خلاف احتجاج ملتا ہے اور ایک نئی مشرقیت پر اصرار بھی۔ تفکر کا انداز ان کی شاعری پر بہر حال غالب ہے اور جدید مشرقیت کا احساس انہیں اپنے معاصرین میں خاص امتیاز بخشتا ہے۔ راشد کی شاعری آہنگ کے لحاظ سے بھی اپنی نمایاں انفرادیت رکھتی ہے۔ ن۔م۔راشد کا انتقال لندن میں ۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ہوا۔

محمد جمال الدین اطہر

Islam Nagar, Purnea (Bihar)

پروفیسر احمد حسن دانشؔ: ایک استاد ایک سماجی خدمتگار

پروفیسر احمد حسن دانشؔ کو انتقال کئے ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے، لیکن آج بھی وہ سبھوں کے دلوں میں اس طرح موجود ہیں، جیسے لگتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔ پروفیسر احمد حسن دانشؔ گونا گوں شخصیت کے مالک تھے اور مختلف اصناف سخن میں مشاق۔ وہ اگر چہ نثر میں بھی لکھتے تھے، لیکن ان کی نمایاں خصوصیت شاعری ہے۔ وہ نوگچھیا (بھاگلپور) کے مکھا تکیہ گاؤں میں ۱۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی طیب علی صاحب سے حاصل کی۔ ہائی اسکول نوگچھیا سے انہوں نے ۱۹۶۰ء میں میٹرک کیا، ڈی ایس کالج کٹیہار سے ۱۹۶۲ء میں انٹر اور بی اے آنرس ٹی این بی کالج، بھاگلپور سے ۱۹۶۴ء میں کیا، پھر ایم اے اردو (طلائی تمغہ)، ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کی سند مظفر پور یونیورسیٹی سے لیا اور ڈاکٹر شمیم احمد کی نگرانی میں ''بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ان کا یہ مقالہ ۱۹۸۹ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔

پروفیسر احمد حسن دانشؔ نے عملی زندگی کی ابتدا وکالت سے کی۔ پریکٹس اچھی چل رہی تھی، مگر وکالت کرتے ہوئے چند سال ہی گزرے تھے کہ پورنیہ کالج میں بحیثیت لکچرران کی تقرری ۱۹۷۳ء میں ہوگئی اور ملازمت کی مدت پوری کر کے ۲۰۰۵ء میں بحیثیت صدر شعبہ اردو بی این منڈل یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ راقم کو بھی پورنیہ کالج پورنیہ میں ۱۹۹۲ء تک آپ کی شاگردی میں رہنے کا اعزاز حاصل ہے۔ استاد محترم کالج کی مصروفیت کے باوجود مطالعہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں کے عالم تھے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی اردو کی تصانیف میں ''بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا'' (۱۹۸۹ء) ''شمع پگھلتی رہی'' (افسانوی مجموعہ ۲۰۱۰ء) ''پیکر سخن'' (شعری مجموعہ ۲۰۱۱ء) ''جانچ پرکھ'' (ادبی مضامین ۲۰۱۵ء) ''بہار میں اردو مثنوی کی تاریخ وتنقید''، ''سیمانچل میں اردو شاعری'' (۲۰۱۹ء) ''علامہ اقبالؔ کے اردو کلام میں قرآن وحدیث کی ترجمانی'' (۲۰۲۱ء) ''مثنوی کا فن اور بہار کی معروف مثنویاں''، ''پورنیہ کا ساہتیک بھوگول'' (ادبی جغرافیہ، قدیم پورنیہ کی منظوم ادبی تاریخ) اور ''ڈراما آنکھ کا تارا'' شامل ہیں۔ ہندی کی دو کتابیں ''سر سریتا'' (اردو ہندی غزلوں کا مجموعہ) اور ''پگ پگ دیپ جلے'' (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ۲۰۱۲ء) بھی اشاعت یافتہ ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ غیر مطبوعہ کتب ہیں جو اب تک اشاعت کے منتظر ہیں۔ بالآخر اسی طرح اپنی علمی پیاس کو بجھاتے ہوئے وہ ۱۰ جولائی ۲۰۲۳ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی نگرانی میں بیس سے زائد طالب علموں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کی حیات اور کارنامے پر پی ایچ ڈی بھی ہو چکی ہے۔ پروفیسر احمد حسن دانشؔ نے جن موضوعات اور شخصیات پر اپنی نگرانی میں جامعاتی تحقیق کرائی، ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

''مولانا عیسیٰ فرتاب: حالات اور شاعری'' (ڈاکٹر فرحت آرا) ''مثنوی ہرمز نامہ: ترتیب وتدوین'' (ڈاکٹر محمد ہاشم) ''حکیم رکن الدین داناؔ کی ادبی خدمات'' (ڈاکٹر غلمان یزدانی) ''مولوی سلیمان: حیات وخدمات'' (ڈاکٹر کلیم اللہ) ''سرسید احمد خان کا اردو ادب میں مقام'' (ڈاکٹر ممتاز عالم) ''اردو شاعری میں قدیم پورنیہ کی خدمات'' (ڈاکٹر عنصری بدرؔ) ''ڈاکٹر سلامؔ سندیلوی: حیات اور شاعری'' (ڈاکٹر شاہینہ پروین) ''ڈاکٹر سلامؔ سندیلوی کی نثری خدمات'' (ڈاکٹر شبانہ پروین) ''پروفیسر طارق جمیلی کی ادبی خدمات'' (ڈاکٹر سجاد اختر) ''پورنیہ کے فارسی شعرا وادبا'' (ڈاکٹر نسیم اختر) ''اکمل یزدانی کی ادبی خدمات'' (ڈاکٹر شاہنواز بابل) ''سیمانچل میں

اردو فکشن'' (ڈاکٹر شازیہ نسرین)

ممکن ہے اس فہرست میں، میری یادداشت کے سہو سے کچھ عنوان چھوٹ رہے ہوں، لیکن بجائے خود یہ فہرست بتا دیتی ہے کہ علاقائی سطح پر تحقیق و تنقید سے وابستہ اتنے متنوع موضوعات پر طلبا و طالبات کی رہنمائی کرنے والی شخصیت کوئی معمولی علمی شخصیت نہیں ہو سکتی۔ اسے ان کے تنقیدی اور تحقیقی شغف اور انتخاب موضوعات میں ان کے زبردست شعور کا خاص فیضان ہی کہا جائے گا کہ اس طرح اردو تحقیق و تنقید کے ایک اہم گوشے کو پر کرنے کے لئے انہوں نے جامعاتی تحقیق کا دروازہ وا کر دیا اور نہ صرف مختلف اصناف ادب خصوصاً مثنوی کے تعلق سے خود اہم تاریخی کتابیں لکھیں، سیمانچل میں اردو شاعری کا کیف و کم دکھایا، اقبالیات کے تعلق سے ایک اہم گوشے کو اپنی تحریر کے کمان و کمند کا اسیر بنایا اور ڈرامے اور افسانے لکھے اور ہندی رسم خط میں کتابیں منظر عام پر لائیں، بلکہ طلبا و طالبات کو بھی ایسے موضوعات اور ایسی شخصیات پر کام کرنے کی ترغیب دلائی جن کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی تھی، پھر یہ کہ انہیں اپنی علمی سرپرستی اور نگرانی سے بھی پوری شفقت اور توجہ کے ساتھ مستفید کرتے رہے۔

پروفیسر احمد حسن دانش یقیناً اردو اور فارسی کے مایہ ناز اساتذہ میں تھے اور عظیم آباد جیسے علمی و ادبی مرکز سے بہت دور رہ کر سیمانچل کی دھرتی پر انہوں نے اردو و فارسی نقد و ادب اور تحقیق و تدوین کی جو آبیاری کی ہے، اسے مدتوں بھلایا نہیں جا سکے گا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے اندر بہت ہی خاص شعری شخصیت بھی رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کی کتاب ''پیکر سخن'' سے ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعری کی ابتدا میں پروفیسر اختر قادری سے اصلاح لی، پھر انہیں کی ایما پر آزادانہ طور پر شعر کہنے اور لکھنے لگے۔ ان کے شعری محاسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معروف نقاد پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''مجھے احساس ہے کہ احمد حسن دانش اردو شاعری کے فکری و فنی آفاق سے آگاہ ہیں، ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات ہیں۔ ان کی شاعری ان کے اپنے شعور و وجدان کی مظہر ہوگی، اس کا مجھے یقین ہے۔''

اور جیسا کہ وہاب اشرفی نے لکھا تھا، واقعی ان کا یقین ایک حقیقت بن کر سامنے آیا۔ پروفیسر احمد حسن دانش کے مجموعہ ''پیکر سخن'' میں حمد، نعت، آزاد نظم، غزل، سہرا اور رخصتی غرض کہ مختلف اصناف کے نمونے موجود ہیں۔ فی الوقت ان کی نظم ''برلن کی دیوار'' دیکھئے۔

دیوارِ برلن

دو دلوں کے درمیان کھڑی تھی
دو دلوں کی دھڑکنوں کو بانٹتی تھی
جذبات کو چیرتی ہوئی، انسانیت کو کاٹتی تھی
اب جو دل مل گئے ہیں
دھڑکنوں کے سلسلے ایک ہو کر
جذبات کے طوفاں امڈ پڑے ہیں
اب وہ دیوار کہاں گئی؟ مسمار ہو گئی ہے
ایسے ہی جذبات درکار ہیں وطن کو
ایسے ہی طوفان درکار ہیں چمن کو
جو نفرتوں کو مسمار کر دے!
وطن کے دشمنوں کو سنگسار کر دے ــــــ اور
پیراہن کدورت کو چاک کر دے

درج بالا نظم اگر چہ کہنے کو ایک سیاسی نظم ہے، لیکن اس میں یقینی طور پر عصری احوال کے تناظر میں نہایت ہی قیمتی پیغام بھی دیا گیا ہے۔ یہاں دیوار برلن سے اپنی بات شروع کر کے پروفیسر احمد حسن دانش نے جس

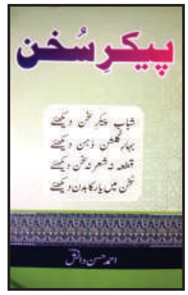

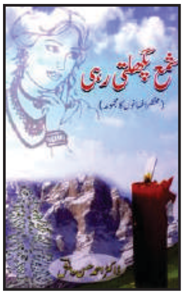

طرح وطن کے تعلق سے، اُسے عصری حسیت اور پیامی اظہار تک پہنچایا ہے وہ بہرحال دیدنی ہے۔ بڑا شاعر ذہن ساز ہوتا ہے اور تاریخی باتوں سے غذا لے کر حال کی اصلاحی ضرورتوں کا احساس دلاتا ہے۔اس لحاظ سے استاد محترم کی یہ نظم ،فکری وفنی طور پر ان کی شاعرانہ عظمت پر گواہی دینے کے لئے کافی ہے۔ اس نظم میں استعاروں کی بہار بھی نہایت دل پذیر ہے جو ذہن کو اپیل کرتی ہے۔احمد حسن دانشؔ کی شاعری میں ہندی کا حسن استعمال بھی دیدنی ہے۔مثال کے لئے یہ شعر دیکھئے ؎

آؤ کہ پیار کا اپدیش میرے گیت میں ہے
گاؤ کہ پرگتی کا سندیش میرے گیت میں ہے

پروفیسر دانشؔ موقتی اور منظری وسماجی شاعری پر بھی زبردست عبور رکھتے تھے، ان کے کلام میں مطالعہ کی بہار بھی ہے اور مشاہدے کا حسن بھی، مثلاً وہ ۲۰۰۷ء میں ایک تاریخی گاؤں ہری پور گئے تو اس گاؤں پر ایک نظم لکھ دی اور اسے وہاں پڑھا بھی۔نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

ہری پور ہے مسکن باکمال
ہیں لعل و گہر اس کے نجم و جلالؔ
یہیں پر ہوئے ایک یوسف رشیدی
ہری پور کا ان سے نکھرا جمال

پورنیہ اور اس کے قرب وجوار کے اضلاع میں کوئی ادبی جلسہ ہو اور اس میں احمد حسن دانشؔ کی شرکت نہ ہو،تو وہ جلسہ ادھورا اور پھیکا پھیکا سمجھا جاتا تھا دل جوئی ان کے مزاج کا خاص عنصر تھا،یہی وجہ ہے کہ علالت ونقاہت کے باوجود وہ منتظمین کو اپنی شرکت سے محروم نہیں رکھتے تھے۔ سیمانچل جیسے دور دراز کے علاقے میں رہنے کے باجود آپ نے جس طرح علم وادب کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، شعروسخن کی دنیا آباد کی اور تشنگانِ ادب کی آبیاری کی وہ یقیناً مدتوں ان کی ہمہ جہت عظمتوں کا احساس دلاتی رہے گی۔جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا، احمد دانشؔ کی خدمات کے اعتراف میں بھی کمی نہیں رہی۔ان کی علمی شخصیت کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا۔ان کے علمی کارناموں پر ڈاکٹر محمد فرقان (سہرسہ) نے بی این منڈل یونیورسٹی مدھے پورہ میں ۲۰۲۱ء میں ’’احمد حسن دانشؔ: حیات وادبی خدمات‘‘ کے عنوان پر اپنا تحقیقی مقالہ جمع کیا جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی اور جناب دانشؔ کی کئی تصنیفات پر بہار اردو اکادمی نے بھی انہیں اپنے گراں قدر انعامات سے نوازا۔

عموماً ہمارے شعرا و ادبا، خصوصاً اعلیٰ تدریسی مناصب پر فائز شخصیتیں زبان وادب کے فروغ میں مسلسل حصہ داری ہی کافی سمجھتی ہیں،لیکن استاد گرامی کی زندگی کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ایک مخلص اور فعال سماجی خدمتگار کی حیثیت سے تادمِ آخر یں اپنی محکم اور مقبول پہچان بنائے رہے۔ آپ ’’انجمن اسلامیہ‘‘ (پورنیہ) کے دومرتبہ سکریٹری بنائے گئے اور اس انجمن کو اپنی بہترین صلاحیتوں سے نوازا۔ آپ کی سکریٹری شپ کا پہلا دور ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۳ء تک اور دوسرا دور ۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۲ء تک رہا۔آپ نے اپنی مدت کار میں خزانچی ہاٹ کی جامع مسجد کی توسیع اور تزئین کاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انجمن کے تحت چلنے والے مدرسہ، قبرستان اور مقامی عیدگاہوں کے نظام کو درست کرایا اور قبرستان کی چہاردیواری بھی آپ ہی کے دور میں مکمل ہوئی۔آپ رابطہ اردو لائبریری جو اسلام نگر مادھو پاڑہ میں تھی کے کافی فعال اور متحرک سرپرست تھے اور لائبریری کو آگے بڑھانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔آپ نے سجاد کالونی میں ایک تنظیم بنانے کی بھی شروعات کی تھی جس میں شادیات کے موقع سے کام آنے والے مطبخ، ضیافت وغیرہ کے ضروری سامان مثلاً دیگ کھانے کے برتن، کرسی ٹیبل اور شامیانہ وغیرہ کی خریداری کر کے انہیں ایک جگہ جمع کرنا شامل تھا،مگر افسوس کہ یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

میں جب بھی پورنیہ جاتا تو ان سے ضرور ملتا۔ میں انہیں چچا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ ملتے تو بہت شفقت کے ساتھ اور بہار اردو اکادمی کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ پٹنہ آتے تو گورنمنٹ اردو لائبریری میں کافی وقت دیتے اور بہار اردو اکادمی میں بھی آتے اور مجھ سے بھی ضرور ملتے، خیریت دریافت کرتے اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازتے۔ بیشک ایسی ہی شخصیات کے لئے کہا گیا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بہت مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❀❀❀

مقالات

ڈاکٹر محمد قیام نیئر

At+Po.- Bardaha, Kamtaul, Dist- Madhubani-847304 (Mob. 9973743606)

راشد انور راشد بحیثیت خاکہ نگار

راشد انور راشد نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں جو ادبی حلقوں میں مقبول بھی ہو چکی ہیں، لیکن ان کے خاکے بھی کم اہمیت کے حامل نہیں، انہوں نے کئی اچھے خاکے لکھے، جیسے ''خورشید الاسلام: شخص اور شاعر''، ''مجاز بحیثیت ترقی پسند شاعر''، ''انتشار زمانہ کا نباض: جاں نثار اختر''، ''فیض: رومان اور انقلاب کا سنگم''، ''قمر رئیس بحیثیت شاعر''، ''صدیق مجیبی: تیکھے لہجے کا بے باک شاعر''، ''سید امین اشرف وارث کرمانی''، ''وہاب دانش''، ''فرید پربتی'' وغیرہ۔

راشد انور راشد نے اپنے خاکے میں خاکہ نگاری کے فن کا بہت حد تک خیال رکھا ہے۔ عام طور پر ان کے خاکے شخصی خاکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہر خاکے کو حقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور پیش کش کا انداز ایسا ہے کہ قاری پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ سید امین اشرف پر لکھے گئے ان کے خاکے کے ابتدائی حصے دیکھئے:

> ''دنیا کے اسٹیج پر پیش ہونے والے زندگی کے ڈرامے میں کب اور کہاں سے ڈرامائی موڑ شامل ہوں گے، اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا، یہاں تک کہ تمام انسان جو اس ڈرامے کے کردار ہیں خود اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ اگلے لمحے کون سا عمل ان سے سرزد ہونے والا ہے۔ نیلے آکاش پہ کوئی ڈور لیے ہوئے بیٹھا ہے اور ہم بے بس اور مجبور کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر زندگی کا رقص کرنے کے لیے مجبور ہیں اور ڈور تھمی اور زندگی کا کھیل درمیان میں ہی افسوس ناک انجام کو پہنچا۔ سید امین اشرف کی اچانک رحلت، زندگی کے حد درجہ ڈرامائی موڑ کو اس طرح نمایاں کرتی ہے کہ ذہن و دل وقت کے بے رحم سلوک پر خون کے آنسو روتا ہے۔ بلاشبہ ہر ذی نفس زندگی اچانک ہی موت سے گلے ملتی ہے تو درد کی ٹیس سے پورا وجود پارہ پارہ ہو کر بکھرنے لگتا ہے۔'' (آثار لفظ، سید امین اشرف، ص ۱۸۹)

راشد انور راشد کے بیشتر خاکے ان لوگوں پر ہیں جن کے وہ بہت قریب رہ چکے ہیں۔ انہوں نے جن ہستیوں پر قلم اٹھایا ہے، وہ نامور ہستیاں ہیں۔ ان کے حالات اور واقعات ہم لوگوں کے لیے کئی لحاظ سے قابل تقلید ہو سکتے ہیں۔ شخصیت کی عکاسی میں انہوں نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ ہمدردی کا عنصر ان کے کم و بیش ہر خاکے میں موجود ہے۔ انہوں نے مصنف کے خیالات و جذبات و احساسات کی آئینہ داری کی ہے۔ اپنے آپ کو ان سے بہت حد تک الگ رکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود مصنف کے جوہر کھل جاتے ہیں۔ انہوں نے جن ہستیوں پر قلم اٹھایا ہے اان کے اندر انسان دوستی کی بہترین صفات موجود تھیں:

> ''امین اشرف ان لوگوں میں تھے جو خلق خدا کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ محبت کی دولت فراخ دلی کے ساتھ لٹانا ان کا خاص شیوہ تھا جو کوئی بھی ان سے پہلی مرتبہ ملتا اسے اجنبیت کا احساس قطعی نہیں ہوتا اور وہ یہی محسوس کرتا جیسے ان سے پرانی ملاقات رہی ہو۔ دلوں کو جوڑنے کا فن انہیں خوب آتا تھا وہ کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے اور اگر پھر بھی کسی کی نازک طبیعت پر کوئی چیز گراں گزرتی اور اس کا انہیں اندازہ ہو جاتا تو معذرت کے سلسلے میں ہمیشہ پہل کرتے۔'' (آثار الفاظ، امین اشرف، ص ۱۹۰)

راشد انور راشد نے عام طور پر شخصیت کے دونوں پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

خاکہ نگار وہی اچھا سمجھا جاتا ہے جو صاحب خاکہ کے اچھے اور برے دونوں اوصاف پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خاکہ لکھنے والے کے لئے شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے، لیکن خاص خاص پہلو جس سے قارئین متاثر ہوں اور وہ بات قارئین کے لئے اپنی اصلاح کرنے کے لائق ہو، ان پر روشنی ڈالنا خاکہ نویس کے لئے بہرحال ضروری ہے۔ ایک اچھا خاکہ نگار، شخصیت کے کمتر پہلو پر بھی ہلکی روشنی اس لیے ڈال دیتا ہے تاکہ خاکہ قصیدہ نہ بن جائے۔ راشد انور راشد نے خاکے کے اس فن کا پورا خیال رکھا ہے:

’’وارث کرمانی سے میرا تعارف ۱۹۹۴ء میں ہوا جب میں جے این یو میں مجروحؔ سلطان پوری کے حوالے سے ایم فل کا مقالہ تحریر کر رہا تھا۔ مجروحؔ کے متعلق وارث کرمانی کا ایک طویل مضمون ’آج کل‘ میں شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے مختلف دلائل کے ذریعے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ غزل کی حد تک مجروحؔ، فیضؔ سے بڑا شاعر ہے اور اہل نظر نے فلمی شاعر کا درجہ دے کر مجروحؔ کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔ اس مضمون نے اس وقت کے عام عقیدے پر ایک زبردست طمانچہ لگایا تھا۔ شروع میں تو اس نظریے سے لوگوں کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہوا لیکن بہت جلد شعر و ادب کی چنندہ شخصیتوں مثلاً اسلوب احمد انصاری، معین احسن جذبیؔ، سردار جعفری اور دوسرے لوگوں نے تحریری طور پر وارثؔ کرمانی کی بات کو تسلیم کیا۔‘‘

(وارث کرمانی، آثار لفظ، ص ۲۰۳)

اس اقتباس سے وارثؔ کرمانی کی سچی تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ وارث کرمانی کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ انہیں فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار بچپن ہی سے یاد تھے، اس لئے شعر کہنے کے دوران وہ شاعری کے معیاری تقاضوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔

راشد انور راشد بے باک نگاری کے لیے بھی اپنے بعض خاکوں میں پہنچانے جاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ وارثؔ کرمانی کی بیبا کی اکثر شعری محفلوں کا مزا کرکرا کرا دیتی تھی۔ داد دینے کے معاملے میں وہ نہایت کنجوس تھے۔ شعر پڑھنے والا، خواہ کسی بھی مرتبے کا ہو، بلا وجہ داد دینے سے پرہیز کرتے۔ ان کے مطابق اگر شعر کمزور ہوتا تو کسی جملے کے ذریعہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے جو اکثر و بیشتر لوگوں کو سخت ناگوار گزرتا۔

’’وہاب دانش‘‘ بھی راشد انور راشد کا ایک اچھا خاکہ ہے۔ وہاب دانش ایک اچھے استاد تھے۔ انہوں نے اپنے پیشے سے کبھی سمجھوتہ نہیں نہ کیا، جس طرح سے انہوں نے وارثؔ کرمانی کے کردار کی خوبی اور خامی دونوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح اس خاکے میں بھی انہوں نے وہاب دانش کی خوبی اور خامی دونوں کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

’’وہاب دانش بعض گھریلو الجھنوں سے ہمیشہ پریشان رہے اور سکون کی دولت انہیں کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ اپنی بڑی بیٹی ممتا کو لے کر وہ کئی برسوں تک گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتے رہے۔ ممتا، بی اے میں میری ہم جماعت تھی۔ دوران تعلیم ہی اس کا معاشقہ ایک غیر مسلم لڑکے ارون سے ہو گیا، جس نے اس کے اعتبار کو بری طرح ٹھیس پہنچائی اور نتیجے کے طور پر ممتا کو خودکشی کرنی پڑی۔ یہ واقعہ کسی کو بھی ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ بے حد حساس ہونے کے بنا پر وہاب دانش نے اس واقعے کا بہت گہرا اثر قبول کیا۔ کم گو تو وہ شروع سے ہی تھے اس واقعے کے بعد عجیب و غریب خاموشی ان کے وجود کا حصہ بن گئی۔‘‘ (وہاب دانش، آثار لفظ، ص ۲۱۵)

راشد انور راشد نے شخصی خاکے زیادہ لکھے ہیں اور شخصی خاکے اور عام طور پر نامور شخصیتوں کے خاکے میں ایسے ایسے واقعات کو انہوں نے پیش کیا ہے جو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں تھے، چنانچہ ان کے خاکوں کو پڑھ کر شخصیات کے بہت سے پہلوؤں کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ بعض موقعوں پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر اس سے محو گفتگو ہیں۔ انہوں نے فرد کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک ایک اچھے فرد کے بغیر اچھے سماج کا تصور ممکن نہیں۔ راشد انور راشد کے خاکوں کو

پڑھ کر ایسا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خاکے کے لیے جو موضوعات منتخب کئے ان کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی تھی جسے وہ اپنے آئیڈیل انسان میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ان کے یہاں انسانی اخلاق کے کچھ خاص تصورات ہیں اور یہ تصورات ایسے ہیں جو انہیں ہمیشہ ہی دل سے عزیز رہے۔

راشد انور راشد کے اندر بیان کی ایسی ادا پائی جاتی ہے جو ان کا اپنا حصہ ہے۔ وہ ہلکی پھلکی اور سادہ اور سلیس باتوں کے درمیان کچھ ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں کہ صاحب خاکہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن پھر فوراً ہی انہیں اس کی تکلیف کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ ایسی بات کرنے لگتے ہیں کہ جنہیں سن کر سامنے والا مسکرا پڑتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، وہی لکھتے ہیں۔ کسی تکلف اور تصنع سے کام نہیں لیتے کیوں کہ ان کی تحریروں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ماحول کے اثر سے ہوتا ہے۔ شاعروں پر انہوں نے جم کر لکھا ہے چوں کہ وہ مشاعرے اور سمینار میں شرکت کرنے کی غرض سے ملک کے دور دراز علاقوں میں جاتے رہے، اس لیے شاعر و ادیب پر اور ان کے واقعات پر ان کی پوری نظر رہی اور خاصا وقوف بھی۔ اس طرح اپنے زور بیان اور لکھنے کے ایک نئے انداز سے انہوں نے ان پر لکھا اور خوب لکھا ہے۔ ان کے لکھنے کا انداز افسانوی ہوتا ہے اس لیے پڑھنے والا پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

راشد انور راشد نے عام طور پر طویل تحریریں نہیں لکھی ہیں، جو ان کے لیے خوبی کا باعث بن گئی ہیں۔ وہ خاکہ نگاری کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے خاکہ نگاری کے دوران اپنی باتوں کو بڑے اچھے انداز سے پیش کر دیتے ہیں:

> ''فرید پربتی (۴؍اگست ۱۹۶۱ء تا ۱۴؍دسمبر ۲۰۱۱ء) سے میری ملاقات دسمبر ۱۹۹۹ء میں شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہوئی تھی، ان دنوں میں وہاں عارضی لکچرر تھا۔ شعبے کے سینئر استاد قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی تھے، جن سے فرید پربتی کے گہرے مراسم تھے وہ جب بھی کشمیر سے دہلی آتے، پروفیسر ہاشمی سے ضرور ملتے۔ پروفیسر ہاشمی نے ہی فرید پربتی سے میرا تعارف کرایا تھا۔ افسانوں کے حوالے سے ہم دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے۔ روبرو ملاقات سے ذہنی قربت میں مزید اضافہ ہوا، پھر تو ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔''

(فرید پربتی، آثار لفظ، ص: ۲۲۵)

راشد انور راشد نے اپنے خاکے میں بہت ہی اچھی زبان استعمال کی ہے اردو نثر میں اس انداز کی تحریریں کم ہی ملتی ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف طریقے سے بیان کر دیے گئے ہوں۔ ہر صاحب خاکہ کے واقعات بیان کرنے میں وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جسے بہر صورت دلچسپ اور دلکش کہا جا سکتا ہے۔ جن اشخاص کی زندگی کچھ غیر معمولی اور کچھ غیر دلچسپ ہوتی ہے وہ ان کا واقعہ بھی وہ اس انداز سے پیش کر دیتے ہیں کہ ان میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ پڑھنے والا بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتا۔ انہوں نے واقعات کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ ان کی یادداشت بھی غیر معمولی تھی، اس لیے واقعات ان کے ذہن میں محفوظ رہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ دوسرے کے کردار پر روشنی ڈالتے وقت اپنے کردار پر بھی روشنی ڈال دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے لئے یہ بات بھلی معلوم نہیں ہوتی، لیکن واقعات کو دلچسپ اور پر لطف بنانے کے لیے اسے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ کسی شخص پر انہوں نے خاکہ لکھا ہو تو ان کی شخصیت سے اخلاقی پہلو نکال لیتے ہیں جو خاکہ نگاری کے لیے اہم تصور کیا جاتا ہے۔

راشد انور راشد نے اپنے خاکوں میں اپنے ہم عصروں کے بارے میں احساسات و تاثرات، ان کی زندگی ہی میں ان پر عیاں کر دیا۔ ان کے اندر کچھ خوبیاں ہیں یا انہوں نے کچھ کارنامے انجام دیے ہیں تو انہیں خوش دلی سے حسن اسلوبی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ مصنف نے جن پر خاکہ لکھا ہے ان کی تصانیف اور تالیفات کا ذکر بھی کیا ہے بلکہ ان کی تصنیف پر مختصراً تنقید بھی کر دیا ہے۔ یہ ان کی خاکہ نگاری کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے:

> ''خورشید الاسلام کی تصانیف اور تالیفات کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ 'رگ جاں'، 'شاخ نہال غم' اور 'جستہ جستہ' ان کے شعری مجموعے ہیں، جب کہ

(بقیہ ص ۳۱ پر)

ڈاکٹر یاسمین اختر
Tank Lane, Bhikanpur, Bhagalpur - 812001 (Mob. 6299062182)

ناصؔر کاظمی کی شاعرانہ عظمت

ایک مشاعرے میں، بڑے بڑے شعرا کے جھرمٹ میں سترہ اٹھارہ سال کا ایک دبلا پتلا نوجوان جب کھڑا ہوا تو لوگوں نے اس کی طرف بے التفاتی سے دیکھا، لیکن جب اس نے اشعار پڑھنا شروع کیا تو سامعین وحاضرین کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ یہ نوجوان کوئی اور نہیں وہی تھا، جسے دنیا آج ناصؔر کاظمی کے نام سے جانتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کی پیدائش ۸؍دسمبر ۱۹۲۵ء کو صوبہ پنجاب کے شہر انبالہ میں ہوئی۔ ان کے والد سلطان محمد کاظم انڈین رائل فورس میں ملازم تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں انہیں مختلف مقامات پر نقل مکانی کرنا پڑتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی نے ابتدائی تعلیم مختلف شہروں میں حاصل کی۔ میٹرک کے بعد ان کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ تیرہ سال کی عمر میں ہی انہوں نے بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کر لیا تھا، جس کا ان کی تحریر پر بہت گہرا اثر پڑا، لیکن ایک نہایت افسوس ناک بات یہ رہی کہ ان کی زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہیں کیا۔ ۱۹۷۲ء میں محض ۴۸ سال کی عمر ہی میں وہ لقمہ اجل بن گئے، لیکن اپنی مختصر سی حیات میں انہوں نے شاعری میں اپنی وہ شناخت قائم کر لی تھی، جس کے لئے طویل مدت درکار ہوتی ہے۔

ناصؔر کاظمی کے کلام کا پہلا مجموعہ ''برگِ نے'' ان کی حیات ہی میں، ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا پھر ان کی وفات کے بعد، ۱۹۷۵ میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''پہلی بارش'' منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کا خاص وصف یہ ہے کہ اس کی تمام غزلیں ایک ہی بحر میں کہی گئی ہیں، لہٰذا تمام غزلوں کے مضامین وموضوعات الگ الگ ہونے کے باوجود وہ سب باہم پیوست نظر آتی ہیں۔

ناصؔر کاظمی کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ ''نشاطِ خواب'' ۱۹۷۷ء میں منصۂ شہود پر آیا، جب کہ ان کی نظموں کا مجموعہ ''دیوان'' ۱۹۷۲ء ہی میں منظر عام پر آچکا تھا، جسے ''آدم جی ایوارڈ'' سے نوازا گیا تھا۔ موصوف کا ایک منظوم ڈراما ''سر کی چھایا'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ بعد میں ان کے مداحوں کی کوشش سے ''کلیاتِ ناصؔر'' منظر عام آیا۔

ناصؔر کاظمی ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں، بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ ''خشک چشمے کے کنارے'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے کئی معروف ادبی رسائل جیسے ''اوراق''، ''ہمایوں''، ''خیال کی مجلس'' وغیرہ کی ادارت بھی فرمائی تھی۔ وہ ریڈیو پاکستان، لاہور سے بھی منسلک رہے اور اپنی وفات تک یہ رشتہ نبھایا۔

غزل گوئی میں انہوں نے استاد حفیظؔ ہوشیاری کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، جو نہایت ہی اخلاص ومحبت سے ان کی غزلوں کی زلفیں سنوارتے رہے۔ یہی سبب تھا کہ ناصر زندگی بھر اردو غزل کی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہے، حالانکہ ناصؔر کاظمی نے جس دور میں شعور حاصل کیا اس میں چہار جانب نظم نگاری کا دور دورہ تھا۔ اخترؔ شیرانی کی نظموں سے متاثر ہو کر ناصر کاظمی نے بھی نظم نگاری میں طبع آزمائی شروع کی، مگر جلد ہی انہوں نے سمجھ لیا کہ نظموں کا میدان ان کے لئے نہیں بنا ہے، لہٰذا نظموں سے دامن چھڑا کر وہ جی جان سے غزل کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔

ناصؔر کاظمی نے اپنی غزلوں میں نظموں کی طرح ایک خیال کا تسلسل پیدا کر کے غزل کو نئے انداز اور نئے طرز سے روشناس کرانے کی

کوشش کی۔ ان کی غزلوں میں کلاسیک اور روایت کا ایک تہذیبی رنگ نظر آتا ہے۔ کلاسیکل شعرا میں موصوف سب سے زیادہ میر تقی میرؔ سے متاثر تھے۔ ان کے کلام میں بھی وہی سوز وگداز پایا

جاتا ہے جو میؔر کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ابتدا ہی سے میر تقی میؔر ان کے محبوب شاعر رہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان، لہجے اور تخیل میں میؔر کا اثر واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض ناقدین و مبصرین نے انہیں جدید دور کا میؔر کہا ہے، لیکن خود ناصؔر کاظمی نے اعتراف کیا ہے کہ وہ میؔر صاحب کے رسیا تو ہیں، مگر میر پرست نہیں۔ میؔر کے لہجے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
تیرا دیا جلانے والے کیا ہوئے

اس سے پہلے کہ بچھڑ جائیں ہم
دو قدم اور میرے ساتھ چلو

اب کے فصلِ بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ
دل ترے بعد سو گیا ورنہ
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ

فن کار اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ ناصؔر کاظمی کی تحریروں پر بھی سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی حالات کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد و ماحول اور معاشرت کی عکاسی نہایت ہی حقیقی انداز میں کی ہے ۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

ختم ہوا تاروں کا راگ
جاگ مسافر اب تو جاگ

جس طرح میر تقی میؔر نے دہلی کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھا تھا، اسی طرح ناصؔر کاظمی نے بھی تقسیم ملک کے دردناک سانحات کا سامنا کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اپنے تجربات و مشاہدات کو اشعار کا جامہ پہنانے کی انہوں نے بھرپور کوشش کی۔ میؔر کی طرح ناصؔر کاظمی کی غزلیں بھی ان کی ذات و کائنات کی آئینہ دار ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری کا کینوس کافی وسیع ہے۔ موصوف نے اپنے اشعار کے وسیلے سے اپنے عہد کے حالات وواقعات، دکھ درد، غم والم اور حزن و کرب کی بھی شاندار عکاسی کی ہے۔ موضوع چاہے جو بھی اور جیسا بھی ہو، انہوں نے شاعری کے حسن کو برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا، مزید یہ کہ وہ اپنی شاعرانہ فنکاری کے ذریعہ الفاظ کا استعمال الگ الگ انداز میں کرتے تھے۔ چونکہ وہ صاف دل اور کھلے ذہن کے مالک تھے اس لئے جو کچھ بھی لکھتے تھے دل سے لکھتے تھے۔ باتوں کو گھما پھرا کر کہنا یا مبالغہ آرائی کرنا ان کی عادت نہیں تھی۔ صاف گوئی، بے باکی اور بیساختگی ان کے فن کی پہچان تھی۔ انہوں نے ثقیل اور ادق الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ ان کی شاعری کی قرأت سے ایسا لگتا ہے، جیسے ایک پورا منظر نامہ ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ناصؔر کاظمی جذبات واحساسات کی لہروں اور خیالات کے نشیب و فراز سے بخوبی تمام واقف تھے۔

ناصؔر کاظمی نے جہاں چھوٹی بحروں میں کامیاب شاعری کی ہے، وہیں طویل بحروں میں بھی اپنا ہنر دکھایا ہے۔ ان کی شاعری کی زبان نہایت ہی نفیس و سلیس ہے، جس کو عام قاری بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ نیز انہوں نے اپنے کلام میں روزمرہ کے الفاظ نہایت ہی شگفتگی اور شائستگی سے استعمال کئے ہیں۔

انہیں جدید غزل کا میر یوں ہی نہیں کیا جاتا۔ آج کا انسان جن حالات سے دوچار ہے اور لوگوں کو جیسی جیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور بھیڑ میں رہ کر بھی وہ جس قدر اکیلا پن محسوس کر رہے ہیں، ان حالات و کیفیات کی ترجمانی ناصر کاظمی نے بڑے حقیقی انداز میں کی ہے۔ میں اپنے ان تمام دعووں کے لئے ان کے کلام کے ذخیرے سے بطور نمونہ چند اشعار پیش کر رہی ہوں ؎

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

نہ آنکھیں ہی برسیں نہ غم ہی ملے
بہاروں میں اب تو نئے گل کھلے

جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے
سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
اٹھو عمل کشو کہ آفتاب سر پہ آ گیا

چپ چپ کیوں رہتے ہو ناصرؔ
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

دیارِ دل کی یہ رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا

بہر کیف، ناصرؔ کاظمی کی غزلیں معنویت سے بھرپور ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان کے کلام میں نہ کوئی الجھاؤ ہے اور نہ ہی پیچیدگی۔ انہوں نے نہایت ہی صاف ستھری اور دل میں اتر جانے والی شاعری کی ہے۔ مذہب، سیاست، معاشرت، جبس، گھٹن، جلن، حسد، تنہائی، بے بسی غرض کہ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ناصرؔ کاظمی کی توجہ سے محروم رہا ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کا عرصہ حیات بظاہر ایک شعلہ مستعجل کے مصداق ثابت ہوا، مگر اس میں کیا شک کہ ان کی شاعری آج بھی اپنی عظمت کا ہمیں اس طرح معترف بنا رہی ہے کہ بسا اوقات بہت سارے شعرا کو، جو اپنے کلام کا پشتارہ چھوڑ جاتے ہیں، ایسی بلندی کی تمناؤں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ❁❁

راشد انور راشد بحیثیت خاکہ نگار (ص ۲۸ سے آگے)

تنقیدیں، غالبؔ، غالبؔ کی ایک نئی تعبیر، ان کی وہ تنقیدی کاوشیں ہیں جنہوں نے ادب کے سخت گیر نقادوں سے بھی خوب خوب داد و تحسین وصول کی۔ تدوین کے کام سے بھی انہیں خاص لگاؤ تھا۔ اس ضمن میں امراؤ جان اداؔ، دیوان قائمؔ اور کلام سوداؔ کی عمدہ تدوین کے ذریعے انہوں نے مستند محققوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ترتیب کے ضمن میں 'آزادی کے بعد کا اردو ادب' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد کئے گئے سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے جس کی بہترین ترتیب کے ساتھ ہی خورشید الاسلام نے ایک تفصیلی مقدمہ تحریر کیا۔ اردو کے ساتھ ہی انہیں انگریزی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔''

(خورشید الاسلام، راشد انور راشد)

خاکوں کو اشاروں کا آرٹ کہا جاتا ہے۔ اس کو نقادوں نے اس طرح سمجھایا ہے کہ ایک پھول کے مضمون میں تمام گلشن کی روح سمائی جا سکتی ہے۔ خاکے میں زندگی کے مختلف پہلو بلکہ ہر پہلو کو سمو لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسے اردو ادب کا ایک کٹھن فن بھی کہا گیا ہے۔ خاکہ نگاری کے فن میں خاکہ نگار کسی شخص کو الفاظ و زبان و بیان کے ذریعے ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ زیر مطالعہ شخصیت کو اس کے اصلی رنگ و روپ اور صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کر دیتا ہے تاکہ اس کی تحریر سے حقیقت کی عکاسی ہو۔ راشد انور راشد نے فن کے اس اصول کو بہت حد تک برتا ہے۔ ان کے خاکے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک اچھے دوست سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا ہو۔ بیشک راشد انور راشد کے خاکے اردو ادب کے ذخائر میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ❁❁

تنویر رضا برکاتی
"Barkaat-e-Habib Manzil" House No. 58, Ward No.31, Harirpura
Burhanpur - 450331 (Madhya Pradesh) (Mob. 9754242468)

امین اعجاز کی نعتیہ شاعری

نعت کہنا وہ مبارک ومسعود عمل ہے جو صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ نعت مبارکہ اصنافِ شاعری کی انتہائی نازک صنف ہے جس میں احتیاط کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اقلیم نعت کے معتبر سفیر علامہ عبدالرحمٰن جامؔی فرماتے ہیں ؎

ھزار بار بشویم دھن ز مشک و گلاب
ھنوز نام تو گفتن کمال بی ادبیست

رحمت اللعالمین کی شانِ اقدس میں کہے گئے اشعار نعت کہلاتے ہیں۔ یہ اشعار کسی بھی ہیئت یعنی مثلث، مربع، مخمس، پابند نظم، نظم معریٰ، قطعہ وغیرہ میں ہوسکتے ہیں۔ آپ کا اسوۂ حسنہ قرآنِ پاک میں خود رب تعالیٰ بیان فرماتا ہے۔ آپ کی عظیم المرتبت شخصیت کے فضائل و شمائل، اوصاف و کردار کا بیان کسی سے ممکن نہیں۔ نعت میں غلو اور مبالغہ کی گنجائش ہرگز نہیں ہوتی بلکہ اندازِ بیان غیر محتاط ہونے کی وجہ سے اُسے گستاخی اور بے ادبی کے ذیل میں شمار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں حسان الہند امام احمد رضا بریلوی فرماتے ہیں:

''نعت شریف لکھنا نہایت مشکل ہے، اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے، اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔'' (بحوالہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی نعت گوئی، جمیل الدین، ص۱۳۲)

برہان پور میں اگرچہ مختلف اصناف میں شاعری ہوتی رہی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شعرائے برہان پور کے مجموعہ ہائے کلام میں ہمیں بس تبرک ہی کے طور پر نعتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ قدیم شعرا کے یہاں بھی نعتیہ مجموعہ یا دیوان کی تخلیق نظر نہیں آتی اور موجودہ دور میں بھی چند شعرا کے نعتیہ مجموعہ ہائے کلام ہی شائع شدہ حالت میں نظر آتے ہیں، جن میں امین اعجاز کے نعتیہ مجموعے اور پھر ''پرورگار بولتا ہے'' (جمیل اصغر) ''توشۂ آخرت'' (ہارون ایاز قادری) ''جلوۂ نور'' (بسم اللہ عدیؔم) ''الف م'' (مرزا حفاظت بیگ ماہؔر) ''یٰسین و طہٰ'' (امین اعجاز) اور ''تجلیات: نادؔم اشرفی'' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ''ثنائے رسول''، خلیل انصاری ایڈوکیٹ کا نعتیہ مجموعہ اشاعت کی منزل میں ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم امین اعجاز کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیں گے۔

امین اعجؔاز کی ولادت برہان پور کے مذہبی اور سماجی خانوادہ میں حاجی حفیظ اللہ صاحب کے یہاں یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ گھر میں مذہبی ادبی ماحول ہونے سے آپ کی شخصیت پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ حاجی حفیظ اللہ مرحوم اپنے زمانے کے شعرا و ادبا کے درمیان قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت راشد برہانپوری سے آپ کے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور ان کی قائم کردہ بزم کے سرپرست کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے۔ اعجؔاز صاحب کے تمام برادران عصری علوم سے بہرہ ور ہیں۔ گھر میں ادبی مذہبی کتابوں اور رسالوں کی کثرت ہونے سے انہیں سازگار ماحول میسر آیا، جس کی بنیاد پر لڑکپن سے ہی انہیں شعروشاعری سے شغف پیدا ہوگیا۔ چنانچہ موصوف نے اعجؔاز تخلص سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ اصلاحِ سخن کے لیے جانشین راشؔد حضرت اخؔتر راشدی سے رجوع کیا۔ آپ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر عارف انصاری رقم طراز ہیں:

''امین اعجؔاز بزم اختر راشدی کے فعال رکن تھے۔ موصوف نے مذکورہ بزم کے اسٹیج سے بے شمار مشاعروں اور نشستوں کا انعقاد کروایا نیز دیگر شعرائے اردو کے شعری مجموعوں کی اشاعت بھی کروائی، جس میں مطیع اللہ

راشد کی چند غزلیات پر مشتمل ’روشن اوراق‘ کی اشاعت ناقابل فراموش ہے۔ زندگی کے ۵۶ سالوں میں اعجاز نے لاتعداد بیرونی مشاعرے پڑھے اور وقتاً فوقتاً اپنے مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت بھی کروائی۔ غزلوں نظموں پر مشتمل ’اعجازِ فکر، صحرا کی پیاس‘ کے علاوہ نعتیہ مجموعہ ہائے کلام ’زیتون کی ٹہنی‘، ’م‘، ’یٰسین و طٰہٰ‘ آپ کی فکروفن کا عکاس ہیں۔‘‘ (برہان پور کی اردو شاعری پر دبستانِ لکھنؤ کے اثرات، ڈاکٹر عارف انصاری ۲۰۱۸ء، ص ۴۶۱)

امین اعجاز نے اپنی پوری زندگی خودداری کے ساتھ شان سے گزاری، لیکن زندگی کے آخری چند سال بڑی کربنا کی سے گزرے۔ اولاد کی نافرمانیوں کے باعث قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ آخر ۲۹ /جولائی ۲۰۰۶ کو اس عالم فانی سے رخصت ہوئے۔

امین اعجاز کے نعتیہ کلام کی جہاں تک بات ہے، آپ کے اشعار عشق رسول سے سرشار ہوکر کہے گئے ہیں۔ موصوف نے نعت رسول کے مختلف موضوعات پر جو کچھ کہا، ڈوب کر کہا ہے، مثلاً ؎

جہاں پہ ہوگی خدا کی باتیں جہاں پہ ذکر رسول ہوگا
وہاں پہ برسے گا ابر رحمت ، وہاں کرم کا نزول ہوگا
حضور کی پیروی ہے لازم وگرنہ سب کچھ فضول ہوگا
نہ کام آئے گا تیرا تقویٰ ، نہ تیرا سجدہ قبول ہوگا

قرآنِ مقدس نبی کریم کی مکمل نعت ہے۔ قرآن ہی نعت کہنے کے لیے ہمارا ہادی و رہبر ہے۔ امین اعجاز کی شاعری میں قرآن پاک کے عطا کردہ نعتیہ مزاج کی چند جھلکیاں ملاحظہ کریں ؎

منسوب ان کے نام سے یہ کائنات معجزہ
قرآن کہہ رہا ہے خود ذات و صفات معجزہ

حیاتِ طیبہ قرآن کی تفسیر ہے بیشک
تمہاری سنتوں کو دین کا آئین کہتے ہیں

خدا کے نور سے آقا تمہاری ذات بنی
پھر اس کے بعد ہی یہ ساری کائنات بنی

اس کائنات کی تخلیق کے پیش نظر رب تعالیٰ کا کیا منشا تھا؟ حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ محبوب اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو کائنات ہست وبود کو بھی وجود میں نہ لاتا۔ پیغمبر اسلام کی زیارت کا شرف جسے ملا ہوگا اس نے ضرور اسے محسوس کیا ہوگا جسے امین اعجاز نے بڑی سادگی سے کہہ دیا ہے بیشک موجودہ مسائل کا علاج سیرت نبوی میں ہی پوشیدہ ہے ؎

اک نظر جس نے تمہیں عالی نسب دیکھ لیا
اس نے تخلیق دو عالم کا سبب دیکھ لیا

سو جتن کرکے نہ ہو پایا زمانے کا علاج
آپ ہی کا ایک نسخہ کارگر لکھا گیا

آپ کی ذاتِ گرامی کائنات میں محبوبیت عظمیٰ کے مقام پر فائز ہے۔ آپ کی شانِ اقدس میں ازل سے لکھا جا رہا ہے اور قیامت تک لکھا جاتا رہے گا، لیکن آپ کی مدحت سرائی کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے ؎

آپ کی مدحت میں جتنا جس قدر لکھا گیا
حشر تک لکھ کر لکھیں گے مختصر لکھا گیا
آپ ہی بعد از خدا سب سے بزرگ و باوقار
یک زباں ہوکر یہ قصہ مختصر لکھا گیا

امین اعجاز کی نعتیہ شاعری میں بڑے بڑے تاریخی وقعات کو تلمیحی انداز میں بڑی آسانی سے شعری قالب میں ڈھالا گیا ہے، مثلاً واقعہ معراج کے تعلق سے یہ شعر دیکھئے ؎

صدیوں کی مسافت ترا پل بھر کا سفر ہو
پھر کہکشاں کیوں نہ تری راہ گزر ہو

امین اعجاز کی نعتیہ شاعری کا ورق ورق عشق رسول کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ ان کی شاعری یقیناً نعتیہ ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ تقدیسی شاعری کے جملہ لوازمات ان کی شاعری میں ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں، جو قلب وروح کو شاد کام بناتے ہیں ؎

عقل محو حیرت ہے دم بخود ہے بینائی
خوشبو میں ہیں رچے بسے کانٹے وہاں ببول کے

(بقیہ ص ۴۷ پر)

سید محمد علی رضوی

Research Scholar, Deptt. of Persian, Delhi University, Delhi (Mob. 8750798456)

فن تاریخ گوئی کی اہمیت وافادیت

ادبی اور تاریخی تحقیق وتلاش میں تاریخی قطعات اور مادوں کی اہمیت وافادیت تسلیم شدہ ہے۔کسی مشہور واقعہ کی تحقیق کے دوران ایک مستند تاریخ کی موجودگی اس واقعے کے سال شمسی وقمری وفصلی وغیرہ کے تعین میں محقق کو بہت ساری دشواریوں سے بچالیتی ہے اور صائب نتائج تک پہنچنے کا راستہ اس کے لئے کھول دیتی ہے۔فن تاریخ گوئی کی روایت کے دامن میں اس کے آغاز وابتدا یعنی آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول سے عصر حاضر تک بے شمار اور طرح طرح کے واقعات و سانحات کے ہجری وعیسوی وفصلی وبکرمی سن محفوظ ہیں، جنہیں حسابِ جمل کے رو سے برآمد کیا جاسکتا ہے۔

اعداد ابجد

حروف	اعداد	حروف	اعداد
ا	۱	ب/پ	۲
ج/چ	۳	د/ڈ	۴
ہ	۵	و	۶
ز/ژ	۷	ح	۸
ط	۹	ی/ے	۱۰
ک/گ	۲۰	ل	۳۰
م	۴۰	ن	۵۰
س	۶۰	ع	۷۰
ف	۸۰	ص	۹۰
ق	۱۰۰	ر/ڑ	۲۰۰
ش	۳۰۰	ت/ٹ	۴۰۰
ث	۵۰۰	خ	۶۰۰
ذ	۷۰۰	ض	۸۰۰
ظ	۹۰۰	غ	۱۰۰۰

تاریخ ادب میں شعرا وادبا کے سال پیدائش اور سن وفات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اکثر متنازعہ فیہ بیانات کا فیصلہ معاصرین کی لکھی ہوئی تاریخوں سے ہی ہوا کرتا ہے۔کتابوں کی تصنیف، اس کی کتابت اور اس کی طباعت واشاعت کے سال بھی ظاہر ہے کہ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔مختلف کتابوں کی اشاعت اور اُن میں تقدیم تاخیر کا اکثر قضیہ کھڑا ہوجاتا ہے، اس وقت ایسے مسائل انہیں تاریخی مادوں سے حل ہوتے اور طے پاتے ہیں۔پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب میں ایسے بہت سارے واقعات اور تاریخیں نقل کی ہیں، جو نفس واقعہ کی اصلیت سامنے لادیتی ہیں۔مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ”تاریخ داوٗدی میں منقول ہے کہ جنگ پانی پت (۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ) میں بابر نے سلطان ابراہیم لودی پر فتح پائی اور اس کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا گیا تو حاضرین میں سے کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے ؎
>
> نو سے اوپر تھا بتیسا
> پانی پت میں بھارت دیسا
> اٹھیسیں رجب شکر وارا
> بابر جیتا براہیم ہارا“
>
> (داستان تاریخ اردو، ص ۱۱)

کسی قوم اور کسی ملک کی ملی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ادبی اور لسانی تاریخ کے گمشدہ اوراق اُن تاریخی مادوں سے صحیح طور پر دستیاب ہوجاتے ہیں جو کسی تاریخ گو شاعر قلم سے ہم تک پہنچے ہیں۔شاعر کسی واقعہ کا مادہ تاریخ نکالنے کے ساتھ ساتھ حالات موجودہ اور اس کے پس منظر پر بھی اک نگاہ ڈالتا ہے اور اشارتاً وکنایتاً ہی سہی اس کا ذکر کرجاتا ہے، یہاں تک کہ یہی مختصر بیان بہت سی شکستہ کڑیوں کو ملانے کے لئے

بسا اوقات از بس کافی ہو جاتا ہے۔

وہ واقعات و معاملات جو شاعر کی زندگی میں پیش آئے ہوں اور اس کے حین حیات رونپذیر ہوئے ہوں، ان کے بیانات کی صداقت میں کلام نہیں، لیکن کبھی کبھی واقعات کے ماہ و سال اور متعلقہ مادوں کی دریافت کے درمیان بہت مختصر سا زمانی فصل ہو جاتا ہے یا صدیاں حائل ہو جاتی ہیں، ایسی صورت میں متعلقہ سال کے تعین اور واقعات کی تحقیق میں سہو و خطا کے قوی احتمال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ عین ممکن ہے تاریخ گو کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے سال و حال کی روایت کا چہرہ ہی مسخ ہو چکا ہو اور اس نے تحقیق کی زحمت اٹھائے بغیر اسی کو درست مان کر تاریخ کہہ دی ہو اور یہ بھی خارج از امکان نہیں کہ تاریخ گو نے ان مادوں کی پیش کش کے مقصد سے جو شعر کہے ہوں ان میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان واقعات کی طرف بھی صراحتاً یا کنایتاً اشارہ کر دیئے ہوں جو خود تاریخ گو کے زمانے میں رونما ہوئے ہوں۔

مذکورہ صورت حال میں مادوں سے برآمد ہونے والے سال اور مبینہ واقعات دونوں ہی سے تحقیقی عمل میں خلل آ جانا عین ممکن ہے، مثلاً ناقدین و مورخین نے اس تناظر میں ابوطالب کلیم کاشانی کی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ لے کر پوری بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کلیم نے اپنی تاریخوں میں بہت سے واقعات حقیقت سے دور رہ کر بیان کئے ہیں جس سے تاریخ کی صداقت معرض شک میں آ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر دیوان ابوطالب کلیم کاشانی (به تصحیح و مقدمه حسین پرتو بیضائی ازانتشارات کتاب فروشی خیام ۱۳۳۶ء خورشیدی) میں تاریخ تولد کے زیر عنوان اور دیوان کامل کلیم کاشانی (بامقدمه و حواشی فرهنگ لغات ازمهدی افشار چاپ ارژنگ، انتشارات زرین ایران چاپ اول ۱۳۶۲ء خورشیدی) میں قطعہ نمبر ۲۶ کے تحت درج ہوا ہے ؎

للّٰه الحمد که از پر تو خورشید قدم
سایۂ رحمتی برسر عالم آمد
عالم فروز دریں زینت دوران گردید
که بخورشید دریں بزم مقدم آمد
نیّری از فلك بادشهی کرد طلوع
که بتاج فلکش جام مسلم آمد
بر زبانِ قلم از غیب پئی تاریخش
شاه شاهانِ جهان قبلۂ عالم آمد

۱۰۰۰ھ

کہتے ہیں کہ ابوطالب کلیم کی تاریخ پیدائش ۹۹۱ھ ہے۔ ظاہر ہے نو سال کی عمر میں اس نے شاہجہاں کی پیدائش کی تاریخ تو کہی نہ ہوگی، لہٰذا اس کے تولد کے عرصہ بعد جب وہ ''شاہ شاہانِ جہانِ قبلہ عالم'' بن گیا ہوگا تب ہی یہ تاریخ کہی گئی ہوگی کہ نو سال کے کلیم سے ایسی برجستہ تاریخ اور پیشگوئی کی امید غلط ہے۔ ❀❀

باتیں ابجد کی

کسی زبان کے مفرد حروف، حروف تہجی، اصلاً فینقی رسم الخط ہجائی کے پہلے چار حروف ''ابجد'' کہلاتے ہیں اور حروف تہجی کی وہ ترتیب بھی ''ابجد'' کہلاتی ہے جس میں حسابِ جمل کے لئے حروف کے اعداد مقرر ہیں نیز اس ترتیب کے مطابق بنائے ہوئے آٹھ کلموں میں سے پہلا کلمہ بھی ''ابجد'' ہے۔ حسابِ ابجد کے لئے ''جمل'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ جمل ایک علم بھی ہے اور ایک فن بھی۔ عموماً حساب جمل اور فن جمل میں فرق نہیں کیا جاتا ہے، حالانکہ ان میں بنیادی فرق ہے یعنی تاریخ گوئی محض حساب جمل نہیں بلکہ فن جمل بھی ہے۔ سوداؔ نے کہا ہے ؎

گر حساب داں ہے تو سمجھ لے تعداد — کتنے ہیں احد کے بحساب ابجد

یقیناً کسی لفظ کا عدد سمجھ لینا یا عدد نکال لینا محض حساب ہے اور اُس سے تاریخ گوئی کا کام لینا حساب کے ساتھ ساتھ فن بھی ہے۔ یوں بھی کوئی عدد تقویمی اشارے کے بغیر تاریخ نہیں بنتا ہے۔ دیگر ادبی اصناف اور علوم و فنون کی طرح تاریخ گوئی کی روایت بھی ہمارے یہاں عربی و فارسی سے آئی ہے اور یقیناً بجائے خود یہ ایک قدیم و عظیم روایت ہے اور اس فن کی اپنی خاص خاص اصطلاحیں جو مادہ تحریر سے تاریخ کے ماہ و سال تک لے جانے میں معاون بنتی ہیں یہاں تک کہ یہ کاوشیں بعض تاریخی سن کے سلسلے میں بیان فیصل بن جاتی ہیں اور علمی اختلاف دور کرنے یا تسامحات کی گرفت کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ (ماخوذ)

افسانے

مالتی جوشی

اردو : اختر کاظمی

Wing-C, Flat No. 904, Archana Hill Town, N.I.B.M.Road, Kausar Baug, Kondhwa, Pune - 411048

جینے کی راہ

ہندی ادب میں مالتی جوشی کا نام بڑا ہی معتبر مقام رکھتا ہے۔ ان کی پیدائش ۴ جون ۱۹۳۴ء کو اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں ہوئی۔ آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء میں ایم۔اے (ہندی) کیا۔ اب تک دو ناول، پانچ بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ اور ۲۹ بڑوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ مختلف تخلیقات کا متعدد ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ دو درجن سے زائد کہانیوں کو ڈراموں کی صورت میں ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کیا جا چکا ہے۔ سات کہانیوں پر شریمتی جیا بچن کے ذریعہ بنائے گئے اپی سوڈ 'سات پھیرے' اور دو کہانیاں گلزار کے ٹی وی سیریل 'کردار' میں اور تین کہانیاں 'بھاؤنا' میں شامل ہیں۔ ہندی اور مراٹھی کے مختلف تعلیمی اور ادبی اداروں کے ذریعہ انہیں کئی اعزازات سے نوازا گیا ہے، جب کہ ان کے تعلق سے مختلف موضوعات پر پونے، کولہاپور، حیدرآباد، اورنگ آباد، اندور اور بھوپال وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں ریسرچ کا سلسلہ جاری ہے۔ (ا-ک)

دروازہ کھولتے ہی اُس نے دیکھا، رنگ برنگی پتنگوں سے گھری اس کی شکل وصورت مجھے بھرت کی یاد دلا گئی۔ ایک بار اسکول میں منعقد ہونے والے بچوں کے میلے میں اس نے اسی طرح گھوم گھوم کر پتنگیں فروخت کی تھیں۔ ہم لوگ بھی وہاں مدعو تھے۔ بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ میرے پاس آیا تھا:

''ماں جی، منے کے لیے پتنگ لیں گی......؟ دیکھئے کتنی خوبصورت ہیں!'' اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''یہ کیسریا دے دو بھائی، ہمارے بچے کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔'' میں نے بھی گاہک کے انداز میں کہا تھا۔ وہ پتنگ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا تھا:

''دس پیسے نکالیے۔''

''دس پیسے؟ باپ رے! اتنی مہنگی!''

اور میں نے ہنستے ہوئے ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور میرے منع کرتے ہوئے بھی اس نے باقی پیسے مجھے لوٹا کر ہی دم لیا تھا۔

''ماں جی...... پیسے......''

''پیسے......!''

کچھ کہتے کہتے میری زبان رک گئی۔ میں حال میں لوٹ آئی۔ میرے ہاتھ میں کیسریا پتنگ تھی اور وہ لڑکا ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ میں اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ دوبارہ یاد دلانے پر ہی پیسے دے سکی۔

اپنی رنگین تام جھام لے کر جب وہ سڑک پر جا رہا تھا تب میں نے اسے دھیان سے دیکھا اور مجھے اپنے ہی اوپر ہنسی آ گئی۔ کیا سوچ کر میں نے بھرت سے اس کا موازنہ کیا تھا؟ بھرت کا گورا، چٹا رنگ تھا، لمبا چھریرا قد، سنہرے بال، نیلی آنکھیں۔ ایک دم یورپین لگتا تھا۔ یاد آتے ہی کلیجے میں کچھ گڑنے لگتا تھا، لیکن ایک لمحے کو مجھے پتہ نہیں کیوں اس بچے میں بھرت کی شبیہ دکھائی دی اور اسی کمزور لمحے کا نتیجہ تھی یہ پتنگ جو میرے ہاتھ میں تھی۔ پتنگ لے کر میں بھرت کے کمرے میں آئی تو انہوں نے مجھے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ لگا کہ کہیں گے۔''

''یہ کیا پاگل پن سوار ہوا ہے تم پر؟''

لیکن وہ کچھ نہیں بولے۔ وہ خود کوئی کم پاگل تھے! دن بھر اس کے پرانے خطوط کو پڑھتے رہتے تھے۔ اس سے دل اوب جاتا تو اس کی کتابیں قرینے سے لگاتے یا اس کے میڈلس اور کپ چمکاتے رہتے۔ میں ان کا ساتھ دیتی ہوئی دن بھر اس کا کمرہ صاف کرتی، اس کے کپڑے پریس کرتی، اس کی میز پر گلدستے سجاتی اور اس کی پیاری کلائی گھڑی میں پابندی سے چابی دیتی۔ اس کا بستر ہمیشہ صاف ستھرا رہتا اور جوتوں کی پالش ذرا بھی دھندلی نہیں ہو پاتی تھی۔

ہم دونوں کی ساری دنیا اس ایک کمرے میں ہی سمٹ آئی تھی۔ کمرے کی سجاوٹ اتنی تازہ دم تھی کہ لگتا تھا، بھرت آج کل میں ہی چھٹی سے لوٹ رہا ہے، جب کہ اصلیت یہ تھی کہ وہ ایسے لمبے سفر پر چلا گیا تھا جہاں سے کبھی کوئی نہیں لوٹتا۔

پتنگ ہاتھ میں لے کر میں نے پورے کمرے میں نظر دوڑائی۔ کہاں لگاؤں اسے؟ میری نظر میز پر گئی جہاں بھرت کی بڑی سی تصویر رکھی تھی، یونیفارم میں۔ نیچے بڑے بڑے حروف میں ویشالی نے لکھا تھا:

''فلائٹ لیفٹیننٹ بھرت کمار''

بورڈر سیکوریٹی فورس کے لیے رسد لے جاتے ہوئے اس کا جہاز ہمالہ کی گپھاؤں میں کہیں کھو گیا تھا، پتہ ہی نہیں چلا۔ بچپن سے اسے آسمان میں اُڑنے کا شوق تھا۔ ہمیشہ اونچے آسمان میں کچھ نہ کچھ دریافت کرنے والے ایروپلین میں اسے ایک خاص دلچسپی رہی۔ بچپن کا یہ شوق بڑے ہونے پر زندگی کا حصہ بن گیا اور موت نے بھی اسی انداز میں اسے اپنے لیے منتخب کر لیا۔

کیسریا پتنگ میرے آسمان کی سیر کرنے والے بیٹے کے فوٹو کے اوپر پھہرا رہی تھی۔

دوسرے دن وہ لڑکا پھر آیا۔ اس بار اس کے پاس پتنگ کے ساتھ کاغذ کی گول گول گھومنے والی چرخیاں بھی تھیں۔ تیسرے دن وہ پھر آیا۔ چوتھے دن اور پھر پانچویں دن بھی۔ وہ روز آتا۔ کبھی پتنگ اور کبھی غبارے لے کر۔ ان کے ساتھ کبھی بانس سے بنا باجا، کبھی کارک کی ریل گاڑی، کبھی سگریٹ کے خالی ڈبوں کا خوبصورت تھیلا، کبھی چائے کے خالی ڈبوں کا قطب مینار۔ اس کے ننھے کلاکار ہاتھ ان پھینکی ہوئی چیزوں میں ایسا جادو بھر دیتے تھے کہ مجھ سے لوٹائے نہیں بنتا تھا۔ میں اس کی مستقل گاہک بن گئی تھی اور بھرت کی میز پر کھلونے کی بھیڑ سی ہونے لگی تھی۔ جوتوں کے خالی ڈبوں سے بنی دو بسوں کے لیے تو مجھے ایک اسٹول کا بھی انتظام کرنا پڑا تھا۔

ایک بار جب وہ آیا، تو اس کے پاس ایک گڑیا تھی۔

''ماں جی، بے بی کے لیے یہ لیں گی.....''

میں گڑیا کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ویشالی کا بچپن یاد آنے لگا۔ تب گڑیوں کی جیسے گھر میں بھیڑ ہو گئی تھی۔

''بہت اچھی نہیں بنی ہے نا''

میری خاموشی کا اس نے کچھ اور ہی معنی لگایا۔'' دراصل ماں کے پاس رنگ برنگی کترنیں نہیں تھیں، اس لیے...... آپ کے پاس ہوں تو دے دیجیے، بڑھیا گڑیا بن جائے گی، بالکل فری میں۔''

اس نے 'فری میں' کچھ اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ بڑی مشکل سے خود کو روک کر میں نے پوچھا:

''ماں کیا گڑیا بناتی ہیں......؟''

''ہاں، فرصت ملتی ہے تب ہی بیٹھ جاتی ہیں......اور وقت پر کام پر جو جانا ہوتا ہے۔''

''نوکری کرتی ہیں......؟''

''نہیں، دو گھروں میں کھانا بناتی ہیں۔ خالی وقت میں کسی نہ کسی کے پاپڑ، اچار، بڑیاں بنوا دیتی ہیں۔''

''پتا جی......؟''

وہ چپ ہو رہا۔ مجھے لگا جیسے میں نے انجانے ہی اسے دکھ دیا ہے۔ موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا:

''پڑھتے ہو......؟''

''جی ہاں، مڈل بورڈ کا امتحان دیا ہے۔ ابھی چھٹیوں میں تھوڑا دھندہ کر کے پیسے جوڑ رہا ہوں۔ سائنس کی فیس زیادہ لگتی ہے نا! ماں دے نہیں سکیں گی۔''

''سائنس لو گے......؟''

''جی ہاں، ڈاکٹر بنوں گا۔'' اور کہتے کہتے وہ ایسے شرما گیا

جیسے لڑکیاں شادی کی بات پر شرما جاتی ہیں۔ میرا جی بھر آیا۔ دو کوڑی کے کھلونے بیچ کر ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھنے والے اس بچے کے لیے مجھے ممتا سی ہوگئی، پھر تو جیسے روز کا معمول سا ہوگیا۔ اس گھر سے وہ کبھی مایوس نہیں لوٹا۔ مالی بابا نے دو چار بار اسے ٹرخانا بھی چاہا، لیکن میری دلچسپی دیکھ کر وہ چپ رہا۔

ننھے پھیری والے کو بھی مجھ میں بھرپور اعتماد ہوگیا تھا کیونکہ اس کا بزنس یہاں خوب چل رہا تھا۔ وہ سب سے پہلے میرے یہاں آتا اور اپنی بیسٹ چیزوں کی نمائش کرتا۔ گڑیا کی آمد کے بعد اس کے لیے چھوٹی سی پلنگ آگئی تھی، جوتے اور صابن کے ڈبوں سے بنا ہوا بنگلہ بھی آگیا تھا۔ شیشے کے ڈھکن سے بنی چھوٹی ترازو تھی، سگریٹ کی پنیوں کے زیورات تھے، سوکھی ہوئی گلکی (تورئی) سے بنا پرس تھا۔ بُننے کی پرانی سلائیوں کی مدد سے بنایا گیا ایک جھولا بھی تھا، جو لان میں لگایا جاسکتا تھا۔ ان تمام چیزوں کی شکل وشباہت بہت اچھی نہیں تھی، لیکن اس کے قوتِ تخیل کی داد دینی پڑتی تھی۔

اکثر ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہتے، ان باتوں کے ذریعہ میں نے اس کی دونوں بہنوں کے بارے میں، ماں کے بارے میں اسکول اور ٹیچر کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چھوٹی اُوما بہت شیطان ہے، رَما بہت اچھا گاتی ہے، ماں کی مالکن مسز بھنڈاری موٹی ہیں، ہندی کے گرو جی نے شدھ نہ رکھی، وہ ہماری ہر بات جھیلنے کو تیار رہے۔ نوکر چھایا کی طرح اردگرد منڈلاتے رہتے۔ ہم لوگوں کو پانی ہاتھ سے لے کر پینا نہیں پڑتا تھا اور بچے؟ وہ تو اتنے پیارے تھے، ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے کہ گہری سے گہری اداسی بھی دور بھاگ جائے، لیکن یہ سارا سکھ ایسا لگتا تھا جیسے چھتیس پکوانوں سے بھرا تھال ہو بغیر نمک کا۔

جولائی گزرتے گزرتے گھر کی یاد آنے لگی اور من بھاگوں، بھاگوں کرنے لگا۔ بچوں کے اسکول شروع ہوگئے تھے اور دن پہاڑ سے لگ رہے تھے۔ برسات میں راستوں کے خراب ہونے کا بھی ڈر تھا، اس لیے اگست کے پہلے ہفتہ میں ہی ہم لوگوں کی حالت کسی بھٹکے ہوئے بچے کی سی ہوگئی تھی۔

شہری حدود میں داخل ہوتے ہوتے ہی ڈرائیور نے بتایا کہ پٹرول ختم ہے۔ شہر کے دوسرے کنارے پر گھر تھا۔ پٹرول پمپ کا سہارا لینا پڑا۔ تھکان سے نڈھال ہوکر میں پیچھے کی سیٹ پر لڑھک گئی تھی۔ ڈرائیور آرڈر دے رہا تھا:

''گاڑی صاف کرنا بھائی، ذرا......''

گاڑی کی حالت واقعی خراب ہوگئی تھی اور غفور محنت سے بھاگ رہا تھا۔ چلتے وقت بخشش کے لیے ایک ننھا ہاتھ اندر آیا، تو ہم دونوں چونک اٹھے۔

وہی تھا! بال کچھ زیادہ بڑھ گئے تھے۔ کپڑے کچھ زیادہ میلے ہوگئے تھے، لیکن آنکھیں وہی تھیں، اعتماد کی چمک لیے ہوئے۔

''تم...... یہاں؟''

''جی! چھوٹی بہن کو ٹائیفائڈ ہوگیا تھا۔ علاج میں کافی پیسہ لگانا پڑا۔ قرض ہوگیا ہے۔''

''......اور پڑھائی؟''

''نائٹ اسکول میں جاتا ہوں۔''

''کیا وہاں سائنس بھی پڑھاتے ہیں؟''

سوال میرے ہونٹوں تک آکر لوٹ گیا۔ میں اس کے دکھ کو نہیں کریدنا چاہتی تھی۔ ڈرائیور سے کہا:

''غفور دروازہ کھول کر اسے اندر لے لو۔''

''جی......!'' وہ چونکا۔

''کچھ نہیں، گھر چلو، پھر بات کریں گے۔''

وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ویشالی نے شاید ٹرنک کال کردیا تھا گھر، دروازہ سب کھلا ہوا صاف ستھرا ملا...... یہ تو نڈھال ہوکر صوفے پر لیٹ گئے۔ وہ سکڑا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے بھرت کی الماری کھولی۔ فنائل کی گولیوں کی بو ناک میں بھر گئی۔ کپڑے ایسے رکھے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی کوئی آکر انہیں پہنے گا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ کب تک انہیں سنبھال کر رکھ سکوں گی۔ دھیرے سے میں نے ایک جوڑی کپڑے نکالے۔ اس کے پاس آکر کہا:

''میرے ساتھ آؤ، تمہیں باتھ روم دکھا دوں۔ منہ ہاتھ

دھوکر فریش ہولو، پھر بات کریں گے۔''

بنگلے کی سجاوٹ اور بناوٹ کو دل فریفتہ نظروں سے دیکھتا ہوا وہ میرے پیچھے پیچھے ہولیا۔

اسے نہانے بھیج کر میں ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دراصل میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی، لیکن کیا کروں، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنا پرس ٹٹولا۔ کل ہی سو کا نوٹ بھنایا تھا۔ ویشالی کو، جمائی صاحب کو، بچوں کو، نوکروں کو......سب کو چلتے وقت کچھ نہ کچھ دے کر اس وقت پرس میں تیس روپیے باقی بچے تھے۔ میں نے سائڈ ٹیبل سے ایک لفافہ اٹھایا اور اس میں وہ روپے رکھ دیئے۔

تب ہی میرے ہاتھوں سے وہ لفافہ چھین لیا گیا۔ پیسوں کے تئیں انہیں کبھی بھی لالچ نہیں تھی۔ بھرت کے جانے کے بعد تو یہ اور بھی مایوس ہو گئے تھے۔ پھر آج...... ؟ میری آنکھوں کے سوال انہوں نے پڑھ لیے، بولے:

'' جو لڑکا اتنی عمر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو رہا ہے، اسے بھیک دے کر ذلیل مت کرو......!''

بات شاید ٹھیک تھی، لیکن اس وقت مجھے اچھی نہیں لگی۔ اسے کچھ دینے کی، اس کے لیے کچھ کرنے کی خوشی مجھ سے چھن گئی تھی۔

نہا دھوکر، میرے دیئے کپڑے پہن کر وہ کمرے میں آیا۔ محویت کے عالم میں، گندے کپڑوں کی پوٹلی کو چھپاتا سا۔

''بیٹھو......!'' انہوں نے کہا۔

وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔

''اپنا نام لکھ کر دکھا سکتے ہو......انگریزی اور ہندی میں؟'' انہوں نے کاغذ اور قلم اس کے آگے سرکاتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ جھجکا، اس نے میری طرف دیکھا، پھر تجربہ کار ہاتھوں سے لکھ ڈالا۔ پہلے ہندی میں، پھر انگریزی میں۔ حروف اچھے تھے، صاف اور بڑے بڑے۔

'' لکھتے تو اچھا ہو! ایک کام کر سکتے ہو؟''

'' کہیے......''

''روز رات میں سات سے نو اپنی ماں جی کے پاس آیا کرو۔ یہ بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ لکھ پڑھ نہیں پاتیں۔ ان کی چٹھیاں وغیرہ لکھ دیا کرنا۔ اگر کہیں تو کبھی رامائن، بھاگوت یا کبھی کبھی اخبار پڑھ دیا کرنا۔''

''جی......رات کو میں......''

'' پڑھنے جاتے ہونا......معلوم ہے مجھے۔ لیکن رات کا اسکول بچوں کے لیے نہیں ہوتا۔ دن میں جایا کرو۔''

''جی......وہ ایڈمیشن......''

''اس کا ذمہ میرا ہے، سمجھے؟ اپنی کتابیں یہیں لے آیا کرو۔ جس دن کام نہ ہو، پڑھتے رہو۔ اتنا بڑا گھر ہے۔ ٹھیک ہے؟ ہم لوگ فی الحال پچاس دے سکیں گے۔ منظور ہے؟''

''پچاس......؟'' حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''اچھا یہ لو اپنا ایڈوانس اور اب جا سکتے ہو۔''

لفافہ ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور میری بھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے روپیوں کو لے کر میں ان کے بارے میں کیا کیا سوچ گئی تھی۔

اس کی جاتی ہوئی شکل وصورت کو وہ بڑی دیر تک دیکھتے رہے، پھر جیسے اپنے آپ سے ہی بولے:

'' پتا نہیں ایسی کتنی ہی صلاحیتیں پیسے کی کمی کے سبب مرجھا جاتی ہوں گی۔''

''سنو......'' یکایک ان کی آواز میں ایک تیزی سی آ گئی تھی: ''سوچتا ہوں اپنے بھرت کے نام سے دو چار اسکالرشپ شروع کر دوں۔ اس کے کون کون سے سبجیکٹ پسندیدہ تھے، یاد ہے؟ ان سبجیکٹ میں ہائی اسکول اور یونیورسٹی امتحانات میں جو ٹاپ کریں گے، انہیں ان کا فائدہ ملے گا۔ اس کے اسکول اور کالج میں بھی کچھ اسکالرشپ الگ سے شروع کر دوں گا۔ کل ہی پرنسپل کو لکھ دوں گا۔''

پھر جیسا کہ ان کی عادت تھی، منصوبہ باقاعدہ لکھے گئے۔ ہم دونوں نے مل کر کچھ ترمیم بھی کیا۔ وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ رام لکھن جب کھانے کو کہنے آیا، اس وقت دس بج چکے تھے اور ہمارے سامنے تین فل اسکیپ کاغذ کا مسودہ تیار تھا:

(بقیہ ص۴۹ پر)

ڈاکٹر شاہد فروغی

C-1/507, Subhash Nagar Housimg,161-M.J.Road, Po.Provash Nagar (Serampore)
Dist- Hooghly-712249(W.B) (Mob.9339624245)

جرم کی چنگاری

ریلوے لائن کے اُس پار ایک گنجان بستی تھی جو ٹاؤن سے ملی ہوئی تھی، وہاں بے شمار ہنر مند مزدور کیڑے مکوڑے کی طرح اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ دن بھر میں سودوسو روپے کمانا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں گلی گلی میں اَنگنت چھوٹے چھوٹے کل کارخانے تھے جن میں بیکری، لوہا لکڑ، واشر اور ڈھلائی کے کارخانے قائم تھے، جن سے یہاں لوگ اپنی روزی آسانی سے حاصل کر لیتے تھے۔ یہ علاقہ دولت کی پیداوار کے لیے زرخیز ہوتے ہوئے بھی تعلیمی لحاظ سے گویا بالکل پسماندہ تھا۔ آس پاس اسکول اور کالج کی ساری سہولتیں موجود ہوتے ہوئے بھی نہ یہاں کوئی بڑا ڈاکٹر بن سکا، نہ انجینئر، نہ وکیل اور نہ کوئی آرٹسٹ۔ بس جس کنبے کے لوگ کچھ سوجھ بوجھ رکھتے تھے، ان ہی کے بچے بڑے ہو کر کسی دفتر میں کلرک یا کسی اسکول کے ماسٹر بن جاتے تھے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہندو مسلم بستیوں میں جوان ہوں یا بوڑھے اپنے محلے میں، گھر کے سامنے یا قریب کسی چائے خانہ یا پان بیڑی سگریٹ کی دکان پر گپ شپ میں وقت برباد کرتے رہتے ہیں اور یہی وہ جگہیں ہوتی ہیں جہاں آپس میں تو تو میں میں یا کسی کی پیٹھ پیچھے شکایت پر لفظوں کی ایک چھوٹی سی چنگاری سلگ کر تنازعہ، جھگڑا، خون خرابہ اور فساد کی آگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

چھنّا بھی اسی ماحول میں جوان ہو کر مضبوط اور سڈول جسم کا مالک بن گیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے پڑھانے لکھانے کی بہت کوشش کی تھی، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ یہ جگہ چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں رہنے لگے، مگر بوڑھی ماں، بیوی، بچہ اور اپنی ملازمت اس کے پیروں کی بیڑیاں بنی رہیں۔ وہ غریب تھا، لیکن عزت دار تھا، اس لئے اپنی عزت کو بچاتے ہوئے اپنے اہل وعیال کی پرورش کرتا رہا۔

بڑھاپے میں جسم کے ساتھ ساتھ حوصلے اور جذبات بھی کمزور اور ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں، اب آخری عمر میں اپنا ڈیرا چھوڑنے کا خیال بھی اس کے ذہن سے غائب ہو چکا تھا۔ صرف رات دن اسے ایک فکر لگی رہتی تھی کہ اس کا بیٹا چھنّا کسی صحیح کام کاج پر لگ جائے تو اس کی روح کو سکون ملے، مگر وہ برے دوستوں کی سنگت چھوڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔

چھنّا کی نظر میں زندگی رنگ رلیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھی اس کے لیے حال ہی سب کچھ تھا، اس نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ اس کی لاپرواہی اور آوارہ گردی کی وجہ سے اس کا باپ اس بڑھاپے میں بھی محنت مزدوری کر کے اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرتا رہا، مگر آخر کب تک، سوکھا پیڑ ایک نہ ایک دن تیز آندھی کی زد میں آ کر گر ہی جاتا ہے۔ سو ایسا ہی ہوا۔

باپ کی موت کے بعد چھنّا پہلے سے زیادہ آزاد اور بے باک ہو گیا کیوں کہ اب اسے ڈانٹنے اور ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے باپ کے رہتے ہوئے اسے پیسے آسانی سے مل جاتے تھے یا اس کی جیب سے وہ نکال لیا کرتا تھا۔ پیسوں کی ضرورت تو ہر انسان کو ہوتی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ قدم قدم پر چھنّا کو پیسوں کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔ غلط آدمی کا ذہن غلط طریقوں سے روپیہ کمانے کی ترکیب سوچتا ہے۔ اسے محنت مزدوری کی کمائی بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ چور اُچکوں اور جواریوں کی صحبت میں رہتے رہتے اس کے دل و دماغ میں خطرناک جراثیم داخل ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جوا کھیل کر اچھے خاصے پیسے بنا لیا کرتا اور کبھی کنگالیوں سے بھی بدتر حالت ہو جاتی تھی۔

چھنّا کا زیادہ تر وقت ریلوے لائن کے کنارے ایک

پھوس کی جھونپڑی کے پاس گزرتا تھا کیوں کہ اس جھونپڑی میں ایک بڑھیا چلو شراب بیچا کرتی تھی۔ چھنّا اکثر شراب کی بھٹی سے ربڑ بلاڈر میں شراب بھر کر کسی جھولے میں چھپا کر اور پولیس کی نظروں سے بچا کر بڑھیا کی کٹیا میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ اس کام کے لیے بڑھیا اسے اچھی خاصی رقم دیا کرتی تھی اور مفت میں اسے شراب بھی پینے کو مل جاتی تھی۔

بڑھیا کا ایک بیٹا تھا جو ویگن بریکر نکل گیا تھا۔ آئے دن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چلتی ہوئی ٹرین سے مال اُتارنا یا ڈبوں کے نیچے سے بیٹری بکس کھول لینا اس کا دھندہ بن گیا تھا۔ اسی چوری میں اس کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا، اس لیے اس کا نام لولا پڑ گیا تھا، پھر بھی اس نے چوری نہیں چھوڑی۔ اب وہ اپنے ساتھیوں کا سرغنہ بن گیا تھا۔ اس کے پلان کے مطابق اس کے ساتھی مال گاڑی کے ڈبوں سے مال اُتار لیا کرتے تھے۔

چھنّا ان سب ہوں کے کرتوت دیکھتا، لیکن اتنی بڑی چوری کرنا اس کے بس سے باہر کی بات تھی۔ آج وہ جوئے میں کچھ زیادہ پیسہ ہار گیا تھا۔ جیب خالی ہوگئی تھی، اس لیے وہ اپنا غم بھلانے کے لیے بڑھیا کی دی ہوئی شراب پینے جا رہا تھا۔

''ابے چھنّا...... بڑھیا کہاں ہے؟''

''وہ نل سے پانی لانے گئی ہے۔''

وہ جانے کے لیے مڑا تو دیکھا، بڑھیا پانی کی بالٹی لیے آ رہی ہے۔ وہ بھی اس کی طرف چل دیا۔ چھنّا جھونپڑی کے پاس بیٹھا ہوا شراب پی رہا تھا، لیکن اس کی نظریں بڑھیا اور اس آدمی پر مرکوز تھیں۔ بڑھیا پانی کی بھری ہوئی بالٹی پھینک کر روتی پیٹتی ریلوے پل کی جانب دوڑی۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ کی وجہ سے وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف ہواؤں کی سائیں سائیں خاموشی کو توڑ رہی تھی۔

بڑھیا کی دردناک آواز چھنّا کے کان میں پڑی تو وہاں سے اٹھ کر پل کی جانب دوڑا۔ بڑھیا پاگلوں کی طرح اس پلیا کے کنارے بڑے نالے میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگی تھی؟ چھنّا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، مگر وہ اپنے ہوش وحواس میں تھا۔ وہ بھی دوسری طرف سے نالے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اس سے تھوڑی دوری پر بڑھیا نے نالے سے کیچڑ میں لت پت ایک کٹی ہوئی منڈی نکالی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اس کے بیٹے لولا کا یہ سر تھا، تھوڑے ہی فاصلے پر اس کا دھڑ اور دونوں بازو بے ترتیب پڑے تھے۔

آناً فاناً اس کٹی ہوئی لاش کو دیکھنے کے لیے سینکڑوں لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ پولیس نے کچھ دنوں تک اپنی تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک ویگن بریکر کی موت کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد پولیس کے ساتھ وہاں کے لوگ بھی اس واقعہ کو بھول گئے، لیکن ایک ماں اپنے بیٹے کی موت کو کیسے بھول سکتی تھی۔ اس کے بیٹے کو کس نے بیدردی سے کاٹا تھا۔ اسے سب کچھ پتہ چل گیا تھا، لیکن ایک اکیلی بوڑھی عورت ایک خونخوار درندہ سے کیسے نپٹ سکتی تھی۔

اب بڑھیا چھنّا کو اپنے بیٹے کی طرح مانتی تھی۔ ڈیڑھ سال کا وقفہ گزر جانے کے بعد ایک روز بڑھیا نے چھنّا سے کہا:

''لولا کو کس نے مارا ہے، میں جانتی ہوں۔''

''تو جانتی ہے چاچی......اسے کس نے مارا ہے......؟ بول کس نے مارا ہے، میں اس کو ذبح کر دوں گا۔''

''وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گی، مگر ابھی نہیں، ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

اس نے شراب کا دھندہ بند نہیں کیا تھا، اس میں محنت کم اور پیسہ زیادہ تھا، اس لیے وہ اپنی جھونپڑی میں سکون کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

ڈیڑھ سال بعد بھی چھنّا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کی زندگی کی رفتار اب بھی پہلے کی طرح بے ڈھنگی تھی۔ بڑھیا کے ساتھ دارو بیچنا اور آوارہ دوستوں کے ساتھ جوا کھیلنا اس کا روز کا مشغلہ تھا۔

ایک روز چھنّا بڑھیا کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل دیکھ کر پوچھنے لگا:

''چاچی......! یہ تیزاب کاہے کو لائی ہے؟''

''کام ہے......''

اس کے بعد ان چھنّا نے بڑھیا سے کچھ نہیں پوچھا۔ چھنّا اپنی غلیظ زندگی سے خوش تھا کیوں کہ اسے بغیر محنت کئے ہوئے روزی روٹی اور پیسے مل جاتے تھے۔ آج وہ صبح سے بڑھیا کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کی مرمت کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک سدھوا کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا:

''سادھو بھیا! جیل سے کب آئے ہو؟''

''دودن پہلے.....ٹھرا ہے تو پلاؤ۔ سالی پولیس نے ہم کو جیل میں سچ مچ کا سادھو بنا دیا تھا۔''

چھنّا اسے جھونپڑی کے اندر لے گیا، زمین پر چٹائی بچھا دی اور شراب کی بوتل اس کے سامنے لاکر رکھ دی۔

''سادھو بھیا اب یہاں کوئی ڈر نہیں ہے، جی بھر کے پیو۔''

''ہاں یہاں سے اچھا کوئی اڈا بھی تو نہیں جہاں چھپ کر کوئی دارو پی سکے۔''

تھوڑی دیر بعد بڑھیا بازار سے سودا لے کر آئی۔

''ارے تو کب چھوٹ کر آیا؟''

''دودن ہوئے چاچی......! آج کی دارو بہت بڑھیا ہے۔ خوب چڑھ رہی ہے۔''

''ارے چھنّا......اس جھولے میں سے دوسری بوتل نکال اور اسے پلا......تو بھی اس کا ساتھ دے۔''

چھنّا کی زبان پر کب سے رال ٹپک رہی تھی۔ بڑھیا کا حکم پاتے ہی وہ بھی سدھوا کے ساتھ پینے لگا۔ دونوں سرور میں آگئے تھے کہ اچانک سدھوا اپنا چہرہ پکڑ کر درد سے کراہنے لگا۔ بڑھیا نے بھرے ہوئے کٹورے کا تیزاب اس کے منہ پر پھینک دیا تھا اور جب اس نے باہر بھاگنا چاہا تو بڑھیا نے لپک کر جھونپڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ سدھوا کو اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا شاید وہ اندھا ہو گیا تھا۔

''ارے چھنّا منھ کیا دیکھتا ہے؟ لے یہ سابڑ اس کے پیٹ میں گھسیڑ دے۔ اسی نے میرے بیٹے لولا کو کاٹ دیا تھا۔''

چھنّا تو نشے میں تھا ہی بڑھیا کا حکم پاتے ہی اس کے دماغ میں غصے کی چنگاری سلگ اٹھی، نہ آگے دیکھا نہ پیچھے۔ بڑھیا کے ہاتھ سے سابڑ لے کر سدھوا کے پیٹ میں بھونک دیا۔ لوہے کا سابڑ اس کے پیٹ سے آر پار ہو گیا۔ تیزاب نے پہلے ہی اس کے چہرے کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی شیطان ہو۔ پیٹ سے آنتیں باہر نکل آئیں۔ اسے جھونپڑی سے باہر نکال کر دونوں پرے ہٹ گئے۔ سدھوا کو اس کے گناہ کی سزا اسی دنیا میں مل گئی تھی۔ آدمی اپنے کرموں کا پھل تو اسی جہان میں پالیتا ہے، اُس جہاں کو کس نے دیکھا ہے۔ سدھوا نے بڑی بے رحمی سے بڑھیا کے بیٹے کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا کیوں کہ سدھوا خود سرغنہ بننا چاہتا تھا۔

اس کے ساتھیوں کو پتہ چلا تو وہ لوگ دوڑے ہوئے آئے، سدھوا کی تڑپتی ہوئی لاش کو اٹھا کر پل پر لے بھاگے، مگر پولیس کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کی لاش وہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

پولیس اس کی زندہ لاش کو کتے کی طرح گھسٹتے ہوئے اپنی جیپ تک لائی، مگر پانی مانگتے مانگتے اس نے دم توڑ دیا۔

پولیس چھنّا کو پکڑ کر لے گئی۔ چھنّا کو جیل موت سے بہتر لگ رہی تھی۔ اسی طرح برسوں گزر گئے۔ اگر چھنّا کی ماں زندہ ہوتی تو دوڑ دھوپ کرتی۔ بڑھیا تھانے میں جانے سے اس لیے ڈرتی تھی کہ کہیں وہ بھی اندر نہ ہو جائے۔ اب چھنّا کو اپنے باپ کی نصیحت یاد آرہی تھی کہ وہ اسے کیوں غلط دوستوں کے ہمراہ اٹھنے بیٹھنے سے منع کرتا تھا۔

چھنّا جیل سے جب چھوٹا تو راستے بھر بڑھیا پر لعنت بھیجتا رہا۔ اسے قانون کی سزا کا خوف نہ ہوتا تو بڑھیا کا آج ہی گلا گھونٹ دیتا۔

بڑھیا نے کتنی عیاری سے اسے تیر بنالیا تھا اور موقع پاتے ہی اسے اپنی کمان میں پھنسا کر دشمن پر وار کر دیا۔ ایک رات پھر اس کے ذہن میں شیطانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور گھر میں رکھے ہوئے مٹی تیل کا کنستر اٹھایا اور بڑھیا کی جھونپڑی کی جانب چل پڑا۔

رات کی سیاہی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے۔ وہ جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بڑھیا بے خبر نیند کی آغوش میں تھی۔ چھنّا نے کراسن تیل کا ڈبہ کھولا اور بڑھیا کی جھونپڑی کے چاروں طرف چھڑک دیا اور کچھ گھر کے اندر بھی ڈال دیا۔ جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی اور جھونپڑی پر پھینک دی اور خود پل پر جا کر جلتی ہوئی جھوپڑی کا تماشہ دیکھنے لگا۔ آگ بڑھیا کے گھر کے اندر بھی لگ گئی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی، لیکن آس پاس کوئی موجود ہوتا تو بچاتا، پھر آدھی رات میں اس کی آواز سنتا بھی کون۔

صبح کو بڑھیا کی جل کر اینٹھی ہوئی لاش پڑی تھی اور جھونپڑی

راکھ میں تبدیل ہوگئی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ ایسا کون کرسکتا ہے، مگر کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ چھنّا پر ہاتھ ڈالے۔ وہ آزادی سے محلے میں گھومتا، جو لوگ چھنّا کو کل ابے کہہ کر مخاطب ہوتے تھے، اب وہ چھنّا سے خوف کھانے لگے تھے کیوں کہ چھنّا کے ہاتھوں اب تک دو جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔

چھنّا کو بھی احساس تھا کہ لوگ ہم سے ڈرنے لگے ہیں۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور محلّہ والوں پر رنگ جمانے لگا۔ وہ کوئی بھی چیز مانگتا تو لوگ بغیر چوں چرا کے اسے دے دیتے تھے۔ اس کے حوصلے بڑھے تو وہ پل یا کسی گلی میں یا بازار کے نکڑ پر سناٹا دیکھتے ہوئے راہ گیروں کو استرا دیکھا کر ان کی کلائیوں سے گھڑیاں، انگوٹھی چھین لیتا۔ اب اس کی آمدنی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی، جس کے نتیجے میں اس نے تین چار اچکوں کو اپنا چمچہ بنالیا تھا۔ اب لوگ اس سے اور بھی خائف ہو گئے تھے۔ اگر کوئی اس سے الجھنے کی کوشش کرتا تو وہ اپنے چیلوں سے اس کا بھرکس نکلوا دیتا۔ کبھی کبھی تو وہ جسم پر استرا بھی چلا دیتا تھا۔ ہر شریف آدمی خون خرابہ سے بچنا چاہتا ہے، اس لیے سب اپنا راستہ لے لیتے تھے۔

آج وہ ساتھیوں کے ہمراہ پل کے نیچے کسی مرغے کے انتظار میں تھا، لیکن کوئی بھی ایسا نظر نہیں آیا جس پر وہ ہاتھ صاف کر سکے۔

''استاد...... ! آج سالا سنیچر کا دن ہے...... دھندہ بہت خراب ہو گئیس۔''

''ابے سالا گھبراتا کیوں ہے؟ چل بیڑی نکال......''

چھنّا اپنے ایک چمچہ سے بیڑی مانگ کر سلگانے لگا۔

''استاد......ایک مرغا آرہا ہے۔''

''ابے سالا یہ پک پک بڈھا کا لڑکا ہے۔''

''تو کیا ہوا استاد آج ہفتہ ہے۔ یہ سالا اپنے کارخانہ سے ہفتہ لے کر آرہس ہے۔''

اس لڑکے کی نظر جب ان لوگوں پر پڑی تو وہ سہم گیا۔ اس نے اپنی جیب کو چھوا وہ سوچنے لگا اگر ان لوگوں نے پیسہ چھین لیا تو کل راشن کیسے اٹھے گا، پھر تو ہفتہ بھر میرے ساتھ بابا کو بھی فاقہ کشی کرنی پڑے گی۔ چودہ سال کی عمر تو بچوں کے پڑھنے لکھنے کی عمر ہوتی ہے، لیکن اسے تو اس کم سنی میں ہی گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑ گئی تھیں۔ اسے پیچھے ہٹتے نہیں بنا کیوں کہ اس کے گھر کا یہی ایک راستہ تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھا۔ چھنّا نے اسے اپنے پاس بلایا۔

''تو اپنے کارخانہ سے ہفتہ لے کر آرہا ہے۔'' پہلے تو اس نے چاہا کہ کہہ دے ''نہیں''، لیکن ڈر سے اس کی زبان سے سچ نکل گیا۔

''ہاں...... مجھے چھوڑ دیجئے یہ میرے ہفتے بھر کی کمائی ہے۔ کل راشن اٹھانا ہے۔''

چھنّا نے اس کے گال پر ایک تھپڑ مارا اور اس کی جیب سے سارا پیسہ نکال لیا۔ وہ رونے گڑگڑانے لگا۔

''ابے سالے بھاگ جا، ورنہ......''

وہ معصوم روتے سسکتے کراہتے گھر کی طرف چلا گیا۔

''لے یہ پچاس روپیہ...... جا...... دو بوتل شراب کباب اور تلا ہوا انڈا لے کر آ۔''

چھنّا اپنے اُسترے کو چومتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس چھوٹے سے اوزار سے میں کتنے لوگوں کو ڈرا دیتا ہوں اور آسانی سے اپنا نوالہ حاصل کر لیتا ہوں۔ اب میں چاہوں تو کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ وہ پل پر کھڑے ہو کر اپنے ساتھی کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے اچانک اپنی پسلی میں آگ کی برچھی اترتے ہوئے محسوس کی۔ وہ اپنے زخم کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے مڑا۔ فوراً اس کمسن لڑکے نے دوبارہ اپنا چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ زمین پر گر کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ ❁❁

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

تنویر اختر رومانی

59, Chuna Shah Colony, P.o. Maango, Jamshedpur - 831012 (Mob. 7004384853)

بلا قیمت

گنیش مینشن، میں ہمیشہ آتا رہتا تھا۔ یہ نیشنل انٹر پرائزز کے مالک گنیش یادو کی رہائش گاہ تھی اور میں اس فرم میں ایک معمولی کلرک تھا، اس لئے دفتری معاملات کے سلسلے میں اکثر وبیشتر مختلف اوقات میں یہاں آتا رہتا تھا۔ ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب بہت ہی اہم کام کے سلسلے میں مالک سے مشورہ یا ان کا دستخط لینا ہوا اور اس دن وہ دفتر نہ آسکے ہوں۔

ہمیشہ کی طرح اس دن میں دوپہر کے وقت کھانے سے فارغ ہوکر، ساتھ میں چند کاغذات لے کر ان کی کوٹھی پہنچا تھا۔ آہستہ آہستہ زینے طے کرتا ہوا اوپر جارہا تھا کہ ٹھٹھک کر رک گیا کیونکہ اوپر سے ایک خوبصورت سی لڑکی اتر رہی تھی......اور وہ لڑکی....وہ لڑکی......

اچانک میرے ذہن میں ماضی کی کتاب کے چند اوراق پھڑ پھڑانے لگے۔ ماضی سے انسان کا بڑا مضبوط اور پائیدار رشتہ ہوتا ہے۔ ماضی ایک کتاب ہے جس میں انسان کی حیاتِ رفتہ کے چند خاکے درج ہوتے ہیں، جس میں دلچسپیاں بھی ہوتی ہیں، خوشیاں بھی، غم بھی، پریشانیاں بھی، کامیابیاں بھی، ناکامیاں بھی اور جسے انسان کبھی کبھی موقع بہ موقع کھول کر یاد تازہ کرلیا کرتا ہے۔

یہ وقت تھا کہ میں نے بھی اپنے ماضی کی کتاب کے چند اوراق کھول ڈالے اور ایک ایک ورق پڑھنے لگا۔

گریجویشن کرنے کے بعد والدین نے میری شادی پر زور ڈالنا شروع کیا اور کافی زور وشور سے رشتے کی تلاش شروع ہوگئی۔ ایک جگہ سے بات آئی اور ہم سب لڑکی دیکھنے گئے۔ لڑکی کے والدین نے ہم لوگوں کی اچھی طرح خاطر مدارات کی۔ نہ جانے بیچاروں نے کس کس جتن سے اتنے کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام کیا ہوگا۔ میرے والدین چونکہ مجھے ایک قیمتی شے سمجھتے تھے، اس لئے میری قیمت زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی فکر میں تھے۔ وہاں بھی میری قیمت ایک لاکھ تلک کی صورت میں رکھی گئی، جس کو ادا کرنا لڑکی کے والدین کے لئے قطعی ناممکن تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ کس طرح لڑکی کے والد ہاتھ جوڑ کر، گڑگڑا کر اپنے آنسوؤں سے میرے والد کے پاؤں دھوتے ہوئے، اپنی غربت کی دہائیاں دے رہے تھے، مگر اس وقت میرے والد ہونے والے سمدھی نہیں بلکہ ایک مہاجن بنے ہوئے تھے اور مہاجن کبھی یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کے سامان کی قیمت کم ملے اور پھر وہاں رشتے کی بات ختم ہوگئی۔ میں طاقت رکھنے کے باوجود اس وقت مجبور تھا اور بھی کئی جگہوں پر میری قیمت لگائی گئی، مگر مطلوبہ قیمت نہیں ملی۔

ماضی کی کتاب بند ہوگئی تھی اور اب میں چونک کر حال میں لوٹ آیا تھا۔ جس لڑکی کو چھ ماہ قبل وہاں دیکھا تھا، وہی اس وقت میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہی لڑکی جو چند مہینے قبل میرے گھر کی زینت بننے والی تھی مگر اب وہ......میں نے اسے غور سے دیکھا۔ مسلا ہوا معمولی لباس، بکھرے بال، پریشان چہرہ، پھیلی ہوئی لپ اسٹک۔ یہ سبھی ایک کہانی کہہ رہی تھیں، ایک درد بھری کہانی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سیٹھ گنیش اس قدر گندا ہوگا۔ سیٹھ کو میں ایک نیک طینت انسان تصور کرتا تھا۔ اس کے لئے میں نے اپنے ذہن میں جو خاکہ بنا رکھا تھا، یہ بات اس کے بالکل منافی تھی، دل تو اب بھی گوارہ نہیں کررہا تھا، لیکن ذہن اس کی تردید کررہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس معصوم کلی کی موجودگی کیا معنی؟ ضرور ایسا ہی ہوگا کیونکہ سیٹھ کے بیوی بچے ہمیشہ سے ہی اپنے آبائی وطن بنارس ضلع میں رہتے ہیں۔

سیٹھ گنیش کے خلاف میرے دل ودماغ نے زہر اگلنا شروع کردیا، مگر میں نفرت کے سوا کیا کرسکتا تھا کیونکہ عصر حاضر کی سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے اور یہ طاقت سیٹھ کے پاس بہت ہے۔ سب سے بڑی کمزوری غربت ہے جو مجھے وراثت میں ملی ہے۔

میں ایک ٹک اس جانی پہچانی لڑکی کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی مجھے بے باکی سے دیکھتی رہی۔

''کویتا......؟''میں نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں.....آپ نے پہچانا تو۔''اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا، جس میں نہ تو طنز تھا، نہ غم، نہ خوشی۔

''کویتا......تم یہاں......''

''میں یہاں......جی ہاں میں یہاں......میں یہاں جسم بیچنے آتی ہوں۔''اس بار لہجے میں مضبوطی تھی۔ میں اس کے اس بے باکانہ جواب کوسن کر ایک بار پھر متحیر رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی بے حجابی سے اپنی جسم فروشی کا اظہار کر دے گی۔

''تم جسم بیچتی ہو......؟''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں، کیا سوال کروں، جو سوال کر رہا ہوں وہ مناسب بھی ہے یا نہیں۔

''تم تو ایک شریف لڑکی تھیں......پھر ایسا کیوں......؟ ایسی ذلت کی زندگی تم نے کیوں اختیار کی؟......اور سیٹھ گنیش اتنا کمینہ ہوگا، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''چپ رہئے ساگر بابو......''کویتا چیخ پڑی۔''دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے اپنے لباس کو دیکھئے۔ غلاظت کے کتنے دھبے ہیں۔ اس ذلت کی زندگی گزارنے پر کس نے مجبور کیا؟ اس کوٹھی تک عزت بیچنے کے لئے کس نے پہنچایا......؟ سیٹھ جی کو کمینہ کہتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی؟ میں انہیں ایک نیک انسان سمجھتی ہوں، جو غریبوں کا پیٹ بھرتے ہیں، ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ بھلے ہی اس کے بدلے، مگر بھوکے تو نہیں مرنے دیتے۔ ساگر بابو، آج کون بے غرض ہوکر دوسروں کی مدد کرتا ہے؟ عزت تو سیٹھ جیسے لوگ بھی لوٹتے ہیں اور آپ جیسے شریف لوگ بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیٹھ جیسے لوگ اس کی قیمت بعد میں ادا کرتے ہیں اور آپ جیسے لوگ تلک، جہیز کی صورت میں پہلے ہی وصول کر لیتے ہیں۔''

وہ تلخ لہجے میں بولتی رہی۔ میں مبہوت کھڑا سنتا رہا۔ میں اپنے اندر اتنی قوت نہیں پا رہا تھا کہ اس کی باتوں کی تردید کرسکوں۔ بھلا حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے؟

وہ بہت پر وقار انداز میں زینوں سے اتری اور چلی گئی۔ میں دور تک اسے جاتے دیکھتا رہا۔

دوسرے دن میں کویتا کے گھر پر دستک دے رہا تھا۔ اتفاق سے دروازہ کویتا نے ہی کھولا۔ مجھے دروازے پر کھڑا دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔

''ساگر بابو آپ......!''

''ہاں کویتا، میں تم سے تمہیں مانگنے آیا ہوں، بلا قیمت......''

❁❁❁

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان وادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔ آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ ازراہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

ڈاکٹر قیصر زاہدی
Alamganj, Loharwa Ghat, GulzarBagh, Patna-800007 (Mob.9525089142)

اللہ کی لاٹھی

بھولا ایک نہایت ہی فریبی اور لالچی شخص تھا۔ وہ سائیکل مرمت کرنے اور پنکچر بنانے کی دکان چلاتا تھا۔ دکان ٹھیک ٹھاک ہی چل رہی تھی، اسے روزانہ اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ وہ آسانی سے اپنی بیوی اور دو بچوں کی پرورش بخوبی کر لیتا تھا، مگر وہ قناعت پسند نہیں تھا، اس لئے اسے صبر وسکون میسر نہیں تھا۔ وہ ہر وقت کسی بھی جائز یا ناجائز طریقے سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی فکر میں مبتلا رہتا تھا۔

ایک دن اس کے ذہن میں ایک نہایت ہی شاطرانہ خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ دکان کے دونوں جانب چند فاصلے پر سڑک کے اوپر کچھ نوکیلی کانٹیاں ڈال دی جائیں، تاکہ سڑک سے گزرنے والی سائیکل کے ٹائر میں جب یہ کانٹیاں چبھ جائیں گی تو لوگ اپنی سائیکل کا پنکچر بنوانے کے واسطے میری دکان پہ آئیں، اس طرح میری روزانہ کی آمدنی میں کافی اضافہ ہو جائے گا اور میں چند ہی دنوں میں خوب پیسے کما کر ایک امیر آدمی بن جاؤں گا، پھر میں سائیکل فروخت کرنے کی اپنی ایک دکان کھول لوں گا، پھر مجھے اور زیادہ آمدنی ہونے لگے گی، تب میں ایک بڑا سا شوروم کھول لوں گا، جس کے اوپر جلی حروف میں رنگین قمقموں سے تیار کیا ہوا ''بھولا موٹر سائیکل شوروم'' کا سائن بورڈ آویزاں ہوگا، پھر ایک دن اس نے ایسا ہی کیا۔ کچھ نوکیلی کانٹیاں خرید کر لایا اور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں جانب سڑک پر ڈال دیا۔

نتیجہ بھولا کی خواہش کے مطابق رہا جب کسی سائیکل سوار کا گزر اس سڑک سے ہوتا تو اس کی سائیکل کا ٹائر کانٹی چبھنے کی وجہ سے پنکچر ہو جاتا اور وہ اپنی سائیکل کو گھسیٹتا ہوا پنکچر بنوانے اس کے پاس پہنچ جاتا، جس کی وجہ سے اس کی روزانہ کی آمدنی میں کافی اضافہ ہونے لگا۔ بعض لوگ جب اس کی دکان پر پنکچر بنوانے آتے اور سڑک پر کانٹی پھینکنے والے کو خوب کوستے اور بھناتے تب بھولا ان کی بھناہٹ اور غصہ و ناراضگی دیکھ کر دل ہی دل میں خوب مسکراتا، مگر اس کا یہ شاطرانہ کھیل زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ جب دوپہر کے وقت اس کا بیٹا گھر سے کھانا لے کر آ رہا تھا تو ایک زنگ آلود کیل اس کی چپل کو چھیدتے ہوئے اس کے تلوے میں کافی اندر تک چبھ گئی۔ وہ درد کی شدت سے کراہ اٹھا اور کھانے کا تھیلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر پڑا۔ اس نے کسی طرح کیل کو اپنی چپل اور تلوے سے نکال تو لیا، مگر اس کا تلوا بری طرح لہولہان ہو گیا تھا۔ وہ کسی طرح لنگڑاتا ہوا اپنے والد کی دکان پر پہنچا اور تلوے میں کیل چبھنے کی بات بتائی تو اس کے والد نے کہا:

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دو تین دنوں میں یہ ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو۔'' مگر ایسا نہیں ہوا۔ روز بہ روز اس کے بیٹے کے تلوے کے درد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ تین چار دنوں بعد تلوے میں جس جگہ کانٹی چبھی تھی ایک بڑا سا زخم بن گیا۔ اب وہ چلنے پھرنے کے لائق نہیں رہ گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنے والد کا کھانا دینے دکان تک بھی نہیں جا پا رہا تھا، لہٰذا بھولا کو اب دوپہر کا کھانا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

بیٹے کی تکلیف دیکھ کر بھولا کی بیوی نے ایک دن کہا:

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اسے نزدیک کے کسی سرکاری اسپتال میں لے جا کر دکھلاؤ۔ تاکہ اس کا زخم ٹھیک ہو جائے، وہ تمہارا دوپہر کا کھانا لے جانے لگے اور تمہیں دوپہر کو بھوکا بھی نہیں رہنا پڑے۔''

بھولا کو بیوی کی بات معقول لگی، اس نے بیوی کی بات مان لی اور بیٹے کو علاج کے واسطے ایک سرکاری اسپتال لے گیا۔ وہاں معالج نے اسے کھانے اور لگانے کی چند دوائیاں دے دیں، مگر دوائیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ زخم اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا تھا اور درد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اب تو اسے بخار بھی آنے لگا تھا۔ جب پڑوسیوں نے

بھولا کے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو اس سے کہا:

''تم اسے شہر کے کسی اچھے سرجن کے پاس لے جاؤ تا کہ اس کا صحیح طریقے سے علاج ہو سکے۔''

بھولا نے پڑوسیوں کے مشورے پر فوراً ہی عمل کیا اور اسے شہر کے ایک مشہور سرجن کے پاس لے گیا۔ سرجن نے پہلے کئی طرح کی جانچ کرائی اور پھر جانچ رپورٹ دیکھنے کے بعد بتایا کہ زخم نے نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ابھی کچھ کہنا مشکل ہے، میں کچھ دوائیاں تجویز کر رہا ہوں اسے تین ماہ کھلائیں، اگر افاقہ ہو گیا تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کا پیر کاٹنا پڑ سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی بھولا حواس باختہ ہو گیا اور اندر تک لرز گیا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ سب اس کی لالچ اور لوگوں کو ناحق مصیبت میں مبتلا کرنے کا انجام ہے۔

جب اس نے دوائیوں کی قیمت دریافت کی تو اس کے ہوش اڑ گئے، مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے دوا خرید لی اور بیٹے کا علاج کرانے لگا۔ کھانے کی چند گولیوں کے ساتھ صبح اور شام کے وقت اس بچے کو انجکشن بھی لگوانا پڑ رہا تھا۔ تین ماہ میں اس کے کئی ہزار روپے خرچ ہو گئے تھے۔ تین ماہ بعد جب بیٹے کو دوبارہ لے کر اس سرجن کے پاس گیا تو اس نے ایک بار پھر کئی قسم کی جانچ کرائی اور رپورٹ دیکھنے کے بعد ایک دوسرے اسپتال کے سرجن کے پاس ریفر کر دیا اور کہا کہ ایک بار اس سرجن سے مل لو، شاید بچے کا پیر کاٹ کر اس کے جسم سے الگ کرنا پڑ سکتا ہے۔ جب بھولا بیٹے کو لے کر اس اسپتال میں پہنچا تو ایک بار پھر نئے سرے سے کئی طرح کی جانچ کرائی گئی اور پھر علاج شروع کیا گیا۔

ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال کے چکر کاٹتے رہنے کی وجہ کر اکثر بھولا کی دکان بھی بند رہنے لگی۔ بیٹے کے پیر کا مرض ٹھیک ہونے تک وہ پوری طرح نہ صرف قلاش ہو چکا تھا بلکہ بیوی کے زیورات بھی فروخت ہو چکے تھے اور وہ مقروض بھی ہو چکا تھا۔

اب اسے پوری طرح یقین ہو چکا تھا کہ بلا شک و شبہ دوسروں کو ناحق تکلیف میں مبتلا کرنے اور لالچ کرنے کا انجام برا ہوتا ہے اور یقیناً اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔

❀❀❀

امین اعجاز کی نعتیہ شاعری (ص ۳۳ سے آگے)

غریبوں بیکسوں کے مونس و غمخوار کی خوشبو
معطر کرگئی دنیا شہ ابرار کی خوشبو

دم بخود ہے ساری دنیا دیکھ کر پتھر کے پھول
آپ کی معجزنمائی آپ کے جوہر کے پھول

کفر کی سرکشی مٹی ، تیرہ شبی لرز اٹھی
دنیا کو جگمگا گئی شمس الضحیٰ کی روشنی

امین آعجاز کی نعتیہ شاعری میں ایسے سیکڑوں اشعار ہیں جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور بے ساختہ قاری سبحان اللہ کی صدائیں بلند کرنے لگتا ہے۔ درج بالا اشعار ان کے فنکارانہ اظہار کے غماز ہیں، احمد کمال پروازی کا یہ اقتباس اس بات کی دلالت کرتا ہے:

''امین اعجاز کے یہاں اس نوعیت کا خلاقانہ عمل شعور و لاشعور کے تانے بانے سے تشکیل پاتا ہے۔ موصوف نعت گوئی کو کلی طور پر عقیدتمندانہ وجدان کی سرگرمی کے طور پر اخذ کرتے ہیں، اس لیے اس میں ایک خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے اور شعر کا پہلا ہی مصرع قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ انہیں اس حقیقت کا علم بھی ہے کہ سیرت پاک کا شعری اظہار اور نعت خوانی کی طلب ہمارے معاشرے کے خمیر وضمیر کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ ان کا لہجہ ہماری وجدانی توقعات پر اثر انداز ہونے کا مستند جواز رکھتا ہے۔'' (یٰسین وطہٰ، امین اعجاز ۲۰۰۵ء ص ۸)

امین آعجاز کلی طور پر تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ آپ کے پانچ مجموعہ کلام بطور ثبوت ہمارے سامنے موجود ہیں، جن میں دو نعتیہ ادب سے متعلق ہیں، جن میں مرحوم نے نبی کریم کی خانگی زندگی، آپ کے اسوہ اور آپ سے عشق پر مبنی متعدد اشعار نظم کیے ہیں، جو ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ ❀❀

انشائیہ

ایس معشوق احمد

Kelam Near Ziyarat Shareef Takibal, Teh. Devisar,
Dist. Kulgam - 192231 (Mob. 8493981240)

کاٹ کھانا

بقول مرزا:

’’ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اخبار پڑھ لیتے ہیں۔‘‘

اُن پڑھے لکھے خوش نصیب لوگوں نے یہ سرخی ضرور پڑھی ہوگی کہ فلاں جگہ کتوں نے ہڑ بونگ مچا رکھی ہے اور متعدد لوگوں کو زخمی کیا ہے۔ کسی کی ٹانگ کاٹ کھائی تو کسی کا پیر زخمی کر دیا اور کسی کسی کی ران پر بھی حملہ ہوا ہے اور وہ لوگ جو اخبار نہیں پڑھتے اور سوشل میڈیا پر دن رات سوشل ہونے میں سرگرداں رہتے ہیں، وہ بھی اس صورت حال سے آشنا ہوں گے اور ان تک بھی ایسی خبریں آتی ہوں گی۔

صاحبو! آدمی بھوکا ہو تو کھانا کھاتا ہے پھر بیچارہ بھوکا کتا کسی انسان کی ٹانگ بھی نہیں کھا سکتا۔ مرزا کہتے ہیں کہ کتا ٹانگ نہ کاٹ کھائے اور تھانیدار رشوت نہ لے تو پہچان میں نہیں آتے کہ ٹانگ کھانے والا تھانیدار ہے اور رشوت کھانے والا کتا۔

ہمارے ہاں اکثر ایسی خبریں گشت کرتی ہیں کہ فلاں نے رشوت کا نوالہ کھا کر دوسروں کا حق کھایا ہے اور بعض کے پیٹ تو اتنے بڑے ہیں کہ باہر لٹک رہے ہیں، لیکن پھر بھی کھانے میں احتیاط نہیں برتتے، جو مل جاتا ہے کھا لیتے ہیں، حتیٰ کہ زمین، جائیداد، کرسی اور دوسروں کا حق تک کھا جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں بعض موقعوں پر تو احتیاط برتی جا سکتی ہے، لیکن کھانے کے معاملے میں بالکل نہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں نے کاٹ کھانے کے بارے میں پڑھا ہوگا اور کچھ نے دیکھا بھی ہوگا کہ کاٹا کیسے جاتا ہے اور کھانے کے لئے کیسی ہنرمندی درکار ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر ہمارے کانوں نے بھی سنی کہ ایک استاد نے دوسرے استاد کا کان کاٹ کھایا۔ کھانے پر ہمیں اعتراض نہیں، جس کی جو مرضی ہے اور جس کا جتنا پیٹ بڑا ہے وہ اتنا کھائے، لیکن وہ کھائے جو کھانے کی چیزیں ہیں، بھلا انسان کا کان بھی کوئی کھانے کی شئے ہے۔ اس واقعہ سے بدگماں ہونے کی ضرورت نہیں کہ استاد نے کان کیوں کاٹ کھایا۔ استاد چونکہ تجربے کرتے رہتے ہیں، اس لئے شاید کان کا مزہ اور اپنی زبان کا ذائقہ بدمزہ کرنے کے لئے تجربہ کیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرے استاد نے دعوت نامہ دیا ہو کہ آ بیل میرا کان کاٹ کھا۔ بہر حال جو بھی وجوہات رہے ہوں، اس واقعہ سنگین سے چند اسباق یاد رکھنے کے ہیں:

(۱) ہمارے ہاں کان کٹے افراد بادشاہ وقت رہے ہیں۔ اس لالچ میں ہوسکتا ہے استاد نے دوسرے استاد سے مشورے کے بعد اپنا کان کٹوایا ہوتا کہ بعد میں کان کٹا بادشاہ ہو جائے اور کھانے والا وزیر بن جائے۔

(۲) غصے پر قابو رکھنا چاہئے، ورنہ استاد جیسا اونچا مرتبہ رکھنے والا شخص بھی باؤلا ہو کر کان تک کاٹ کھا سکتا ہے۔

(۳) ہوسکتا ہے کان نے برا سنا ہو اور سزا کے طور کٹ گیا ہو۔ شکر ہے استاد کی زبان سے کچھ برا نہیں نکلا، ورنہ تصور کیجئے زبان کاٹ کر کھا لیتے تو کیا ہوتا۔

(۴) ہمارے ہاں کسی سے اختلاف کرنا ہو تو احتیاطی تدابیر اپنا کر کان، ناک، آنکھ بچا کر رکھنے چاہئے کہ بات برداشت سے باہر ہو تو دوسرا کچھ بھی کاٹ کھا سکتا ہے۔

(۵) قوت برداشت نہ ہونے کے برابر ہو اور بات طول پکڑ لے تو جھگڑے کی منزل پر دم لے گی اور دوران جھگڑا کچھ بھی کاٹ کھایا جا سکتا ہے۔

(۶) تاریخ میں نام زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ تجربات

کئے جائیں اور کان کاٹ کھانے کا تجربہ نیا نیا ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ۔

کھاتے ہیں استاد تک کان کاٹ کر
رہتے ہیں ہمارے ہاں ہندہ مزاج لوگ

دانا کہتے ہیں کہ زندگی میں کچھ اصولوں پر انسان کو کار بند رہنا چاہئے کہ برامت سنو، برامت کہو، برامت دیکھو اور برامت سوچو، جس کا کان کاٹا گیا وہ کم سے کم ایک اصول اپنی زندگی میں اپنا ہی سکتا ہے کہ وہ اب اچھا برا نہیں سن سکتا۔ البتہ برا کہہ سکتا، سوچ سکتا اور دیکھ سکتا ہے، جہاں تک کچھ کہنے کا سوال ہے تو بقول غالبؔ ''بات پر واں زبان کٹتی ہے'' یہاں غالبؔ نے اگرچہ فقط ''بات'' لکھا ہے، مگر انہیں حالات کا انداز تھا، ہم نے دیکھا ہے، خیر سے آپ میں سے جو دانا و بینا ہیں وہ بھی دیکھ چکے ہوں گے کہ سچ بولنے پر واں ہی نہیں یہاں بھی اور جہاں جہاں بولا جاتا ہے، وہاں وہاں بھی زبان کٹتی ہے۔

اب رہا سوال برامت دیکھو، صاحبو! اس سے برا ہم کیا دیکھ سکتے ہیں جو ہم نے دیکھا ہے۔ کبھی برے حالات، کبھی سنگین جرائم تو کبھی انسان کا وحشی پن کہ چھوٹی بچی کا جسم نوچا جارہا ہے تو کبھی کسی کا قتل کیا جاتا ہے اور جسم کے اتنے ٹکڑے کئے جاتے ہیں کہ سمیٹنا مشکل اور گننا ناممکن ہو جاتا ہے، کبھی سوشل میڈیا پر بے حیائی کا طوفان کہ تین سال کی بچی بھی ناچ رہی ہے اور چالیس سال کی عورت بھی برہنہ ہے۔ اس سے آگے دیکھنے کی اب تاب نہیں کہ اگر یوں ہی انسان کی حرکات جاری رہیں تو وہ دن دور نہیں جب جانور ہم پر ملامت کریں گے اور ہم اُف تک نہ کرسکیں گے۔ مرزا کہتے ہیں کہ خدا وہ وقت نہ دکھائے کہ ع

پھلے پھولے الٹا دھندہ اور اپنی کرتوتوں سے ہو بندہ شرمندہ

جانور انسان کی حرکات وسکنات دیکھ کر ملامت کرے، توبہ! توبہ! ہم یہ کیا برا سوچ رہے ہیں۔ ایک اصول تو یہ بھی اپنانے کی تلقین کی گئی ہے کہ برامت سوچو، جو برا سوچے گا اس کا دماغ......ارے صاحب دماغ کون کاٹ کھا سکتا ہے البتہ دماغ چاٹ ضرور سکتے ہیں، جس کے پاس بیوقوف دوست اور بیوی جیسی بلا ہو اس کا مغز سلامت کیسے رہ سکتا ہے۔ یہ دونوں بھیجا کھانے میں ماہر ہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ سوچنا ہی ہے تو اچھا اچھا سوچنا چاہئے کہ کروڑ پتی کیسے بنا جاسکتا ہے، وزیر با تدبیر کیسے بنا جاسکتا ہے، جورو کا غلام اور حسینوں کا خادم کیسے بنا جاسکتا ہے اور بڑا آدمی بن کر دوسروں پر رعب اور دبدبہ کیسے قائم کیا جاسکتا ہے۔

مرزا یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر ہونے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی خوبیاں دیکھ کر تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں اور برائیوں پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ خاموشی سے یاد آیا، ہم بھی کیسی الٹی سیدھی باتیں کر کے آپ کا قیمتی وقت اور بھیجا کھا رہے ہیں، اس لئے خاموش ہو کر ہم وداع ہوتے ہیں کہ خاموشی ہزار نعمت ہے اور کاٹ کھانے کی بیماری بری۔ مرزا کہتے ہیں کہ کتے اور ڈاکٹر کے سوا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسان کو کاٹے البتہ جیب کاٹنے کا اختیار چور اور رشوت خور کو ہو تو یہ بات اور رہی۔ ❁❁

جینے کی راہ (ص ۳۹ سے آگے)

''کل صبح آفس میں زندگی کا پہلا کام ہوگا انہیں ٹائپ کرنا۔'' انہوں نے کاغذات اٹھاتے اٹھاتے کہا۔

''آفس......!'' میں نے چونک کر کہا۔

آفس میں انہوں نے گزشتہ سال بھر سے پاؤں تک نہیں رکھا تھا۔ جیون (ہمارا ٹائپسٹ) اور جونیئرس ہی سب کام دیکھ رہے تھے۔ موکل آ آ کر لوٹ لوٹ گئے تھے۔

''آپ آفس جائیں گے؟'' میں نے پھر کہا۔

''اور نہیں تو کیا، گھر پر کوئی پیسہ دے جائے گا! منصوبے تو خوب لمبے چوڑے بنائے گئے ہیں، لیکن روپیہ کہاں سے آئے گا؟'' پھر کچھ رک کر بولے:

''اب تو میں کنجوس نہیں ہوں نا!''

''میں نے کب کہا تھا؟''

''ہاں، کہا تو نہیں تھا، لیکن سوچا تو تھا۔'' اور ان کے چہرے پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

سال بھر میں یہ پہلی بار مسکرائے تھے۔ ❁❁

منظومات

نعت پاک

رابعہ نوریؔ
Khara Kuan, Gulzarbagh, Patna City - 800007

غیرت ماہِ مبیں ہے روئے زیبا آپ کا
جلوۂ حسن ازل ، حسن سراپا آپ کا
کیا کوئی انساں بتائے ، کیا ہے عظمت آپ کی
سب سے اونچا ہے خدا کے بعد رتبہ آپ کا
آپ کی تخلیق ہے تزئین عالم کی دلیل
یہ وجودِ عالم امکاں ہے صدقہ آپ کا
مہر تاباں بھی فلک پر تابع فرماں ہوا
چاند دو ٹکڑے ہوا پاکر اشارہ آپ کا
آپ کی خوشبو زمیں والوں کے دل میں ہے بسی
عرش اعظم پر بھی لہراتا ہے جھنڈا آپ کا
صرف انساں ہی نہیں قدموں پہ سر خم کر دیا
سنگریزوں نے پڑھا ہاتھوں میں کلمہ آپ کا
ہم نے یہ دیکھا ہے منظر گنبد خضریٰ کے پاس
موجزن رہتا ہے صبح و شام دریا آپ کا
راہ حق سے مجھ کو نوریؔ کیا کوئی بھٹکا سکے
آنکھوں میں رکھتی ہوں میں نقش کف پا آپ کا

❀❀❀

محمد علیؔ رضا
Pachhi, Dist. Madhubani (Bihar)

اللہ رے یہ شانِ عنایت رسول کی
کون و مکاں پہ چھائی ہے رحمت رسول کی
جتنی تھیں خوبیاں وہ عطا کیں کریم نے
اب مجھ سے کیا بیاں ہو فضیلت رسول کی
نوعِ بشر یہ جان لے قرآن ہے گواہ
بس منزلِ نجات ہے سنت رسول کی
طوفانِ کفر لاکھ رکھے دشمنی مگر
روشن رہے گی شمع ہدایت رسول کی
سب حاجتوں نے سر کو اٹھانا بھلا دیا
ہمت بندھائی ایسی قناعت رسول کی
اپنے نصیب پر رہوں نازاں تمام عمر
ہو جائے خواب میں جو زیارت رسول کی
ہم ہیں گناہ گار ، مگر رب سے ہے دعا
محشر میں ہو نصیب شفاعت رسول کی
نعتوں کا یہ شغف ترا کیا خوب ہے علیؔ
ہونٹوں پہ بھی ہو قبر میں مدحت رسول کی

❀❀❀

غلام صمدانی ندیؔم جعفری

"New Style Tailor" Shahabo Complex, G.B.Road, Gaya - 823001 (Mob. 6205090327)

یہ جہاں محو یاس ہے لوگو!

وہ جو اک بدحواس ہے لوگو — کیا کوئی روشناس ہے لوگو
اس قدر خوں بہہ چکا ہے یہاں — ذرّہ ذرّہ اُداس ہے لوگو
نا امیدی اداسیوں کے سوا — کچھ کہاں اپنے پاس ہے لوگو
امن کی بھیک اب نصیب نہیں — صرف دہشت ہی آس ہے لوگو
بھوک روٹی کی اب کسی کو نہیں — بس محبت کی پیاس ہے لوگو
ان کی چاہت تھی میرے دل کو مگر — ان سے مل کر اُداس ہے لوگو
ایک مدت سے امن کی خاطر — یہ جہاں محو یاس ہے لوگو
میرا سب کچھ تو لٹ چکا ہے ندیؔم — اک اَنا میرے پاس ہے لوگو

❁❁❁

مرد اور عورت کی یک رنگی

کل شب کو تھی اک ہال میں جلوہ کناں حور و پری — یا محو رقص و نغمہ تھے صدہا بتانِ آذری
دل موہ لینے کے لئے ہر شوخ ادا آمادہ تھی — آنکھوں میں کفر ساحری ، ہونٹوں پہ کفر سامری
تہذیب نو کے رنگ سے لبریز تھی ہر اک ادا — ملبوس کی عریانیاں ، انداز کی عریاں گری
تھے زلف و گیسو کی جگہ مردانہ فیشن سر کے بال — وہ تھیں کہ صدہا مغ بچے مست شراب دلبری
یہ دیکھ کر میں نے کہا اک شوخ صبر آشوب سے — ’’ای چہرۂ زیبائے تو رشک بتانِ آذری‘‘
یوں تو مکمل ہے ترا ہر طرح حسن بے مثال — ’’ہر چند وصفت میکنم ، در حسن زاں بالاتری‘‘
لیکن زراہِ لطف مجھ کو دے جواب اس بات کا — کیوں کر گوارا ہے تجھے یہ گیسوؤں کی ابتری
پہلے تو سوچا دیر تک ، پھر مسکرا کر ناز سے — یوں بولی وہ کافر ادا ، مست ادائے کافری
مردانہ فیشن سے غرض اس کے سوا کوئی نہیں — ’’تاکس نگوید بعدازین من دیگرم تو دیگری‘‘

—— اخترؔ شیرانی

منوّر داناپوری

Shahtoli, Danapur Cantt.
Patna - 801503
(Mob. 8789946411)

میں نئی صدی کا جوان ہوں

یہ نئی صدی کا ہے کارواں — جو ہے آسماں میں رواں دواں
کبھی چاند تاروں کے درمیاں — کہیں اس کی زد میں ہے کہکشاں
نئی جستجو کا نشان ہوں
میں نئی صدی کا جوان ہوں

ہے خلا میں جاری مرا سفر — مری تابناک ہے رہ گزر
مرا حوصلہ ، مرا ہم سفر — مرا عزم ہے مرا راہبر
میں زمین والوں کی شان ہوں
میں نئی صدی کا جوان ہوں

نہیں تھم سکیں گے یہ ولولے — ہیں بلند تر مرے حوصلے
کف پا میں ہیں جو یہ آبلے — وہ ہیں انکشاف کے سلسلے
کہ تلاشِ نو کی میں جان ہو
میں نئی صدی کا جوان ہوں

جو ہیں عزم تو نہیں مشکلیں — چلو چاند تارے پہ ہم چلیں
کہ سجائیں گے وہاں محفلیں — مرے شوق کی وہ ہیں منزلیں
نئے بازوؤں کی اُڑان ہوں
میں نئی صدی کا جوان ہوں

ہے نشانِ رہ مرا نقش پا — کہ یہی ہے منزلِ ارتقا
نئی کھوج کرتا رہوں سدا — جو تھا مدعا مجھے مل گیا
میں جہاں کی عظمت و شان ہوں
میں نئی صدی کا جوان ہوں

جو منوّر آج چمن میں ہے — یہ اُسی کی خوشبو وطن میں ہے
مری شاعری مرے فن میں ہے — مرے دل کی بات سخن میں ہے
میں عروجِ فن کا نشان ہوں
میں نئی صدی کا جوان ہوں

❁❁❁

مرغوب آثر فاطمی

Road No.7, Moh. Aliganj, Gaya - 823001 (Mob. 9431448749)

غزلیں

شادیانے کا ہر اک سُر باعث ماتم ہوا
اِس بہانے جی کا لہرانا ذرا مدھم ہوا
بانہہ پھیلائے کھڑا تھا راستے میں انتشار
جو بھی ہونا تھا ہوا ، انداز سے کچھ کم ہوا
پرفسوں تاریخ پر اب تبصرہ کیا کیجئے
جس کو کچھ ہونا نہ تھا وہ قائد اعظم ہوا
بدلیاں چھائیں ، پھڑک اٹھی ہوائے خوش گوار
جن کو آنا تھا نہ آئے یہ بھی کیا موسم ہوا
کون رکھے آستینوں اور سانپوں کا حساب
مختصر یہ ہے کہ اپنا عکس بھی برہم ہوا
گیت الفت کے نہ جانے ہوگئے کس کے اسیر
مجھ سے نالاں رفتہ رفتہ قلب کا سرگم ہوا
جذبہ لطف و کرم پر مردنی کیا چھا گئی
معتبر ، ہاں نام کا بس نطفۂ آدم ہوا
کیا عجب ہے ، دیکھ کر کیوں حسن کا دستورِ نو
ہوش کے کانپے قدم اور شوق بھی بے دم ہوا
منتشر تھا گو تصور کا ہر اک ٹکڑا آثر
مسکرایا جب ترے اشعار میں مدغم ہوا

❁❁❁

جستجو مجھ کو ، یہ مانا ، تھی فلک زادوں کی
پل نہ اک خالی گیا فکر سے بنیادوں کی
باری باری کیا رخصت سبھی ہنگاموں کو
کیوں صدا دیتی ہے زنجیر کہن یادوں کی
زورِ وحشت سے تھے مغلوب پرندوں کے ذہن
اور کہانی تھی الگ سوختہ صیادوں کی
در پہ بے درد کے سر پٹکے کہاں تک کوئی
دل کی دل میں رہیں حیرانیاں بیدادوں کی
لطف خاموش کھڑا رہ گیا دروازے پر
بھیڑ تھی شعبۂ ترسیل میں ایجادوں کی
دفتر حسن میں ڈھونڈا کیا میں دیر تلک
ایک فہرست مکمل نہ تھی ، بربادوں کی
جلوہ سامانیاں تھم تھم کے اُترتیں کب تک
شوق میں ٹوٹ گئیں سرحدیں میعادوں کی
بارِ تکرار سے بوجھل ہوا ایوانِ ادب
بوالعجب کچھ تو ہو زنبیل میں نقادوں کی
تھی تو سرگرداں غزل تازہ زمیں کی دُھن میں
ہڈیاں نکلیں آثر قبروں سے اُستادوں کی

❁❁❁

احمد کمالؔ حشمی

H/28/1, B.L. No.-2, Kankinara - 743126 (West Bengal) (Mob. 9433145485)

غزلیں

سائباں کے تلے کھڑا ہوں میں
دھوپ میں پھر بھی جل رہا ہوں میں

ہوں کسی کا عدو کسی کا دوست
سوچتا ہوں کہ اپنا کیا ہوں میں

تجھ کو سوچوں کہ میں نہیں سوچوں
یہی ہر وقت سوچتا ہوں میں

تم کسی شعر میں کبھی باندھو
ایک آسان قافیہ ہوں میں

میرا ہونا نہ ہونے جیسا ہے
ایک معمولی واقعہ ہوں میں

ایک جگنو نے چاند سے یہ کہا
دیکھ خود سے چمک رہا ہوں میں

کہیں مل جاؤں تو بتانا مجھے
ایک مدت سے لاپتہ ہوں میں

نوحۂ کربِ ذات کس سے کہوں
کور بینوں میں آئنہ ہوں میں

کبھی ٹوٹا تھا اتنے ٹکڑوں میں
آج تک خود کو جوڑتا ہوں میں

لفظ کچھ ہیں ، معانی کچھ ہیں مرے
اے کمالؔ اک محاورہ ہوں میں

❁❁❁

رنگ دکھلائے گی حوا سے محبت میری
میرے ہاتھوں سے چلی جائے گی جنت میری

میری رسوائی کے چرچے ہیں ہر اک محفل میں
مجھ سے دو چار قدم آگے ہے شہرت میری

دیکھ اب اور زیادہ تو ڈرا مت مجھ کو
خوف میرا کہیں بن جائے نہ طاقت میری

بے سبب بھی کبھی مغموم رہا کرتی ہے
اور بہل جاتی ہے پھر خود ہی طبیعت میری

دل کے زخموں کو ہرا کون کرے تیرے سوا
مجھ کو رکھتی ہے ترے ساتھ ضرورت میری

میرے مرنے کی دعا کل سے سبھی مانگیں گے
آج لکھوا لی گئی مجھ سے وصیت میری

ہم سفر اپنا بدلنے کا وہ عادی ہے کمالؔ
راس آ جائے اسے کاش رفاقت میری

❁❁❁

غزلیں

م۔ سروؔر پنڈولوی

Nayatola, Station Road, Pandaul, Dist. Madhubani
(Mob. 9905035274)

الٹا ہر ایک بات کا مطلب نکالنا
دن سے غلط ہے رات کا مطلب نکالنا

خیرات پر غریبوں کا حق ہے تو پھر غلط
خیرات سے نجات کا مطلب نکالنا

شاید اٹھا وہ ہاتھ مدد کے لئے بھی ہو
کچھ اور تم نہ ہاتھ کا مطلب نکالنا

ان جاہلوں کے شہر میں بیکار ہی تو ہے
کچھ بھی قلم دوات کا مطلب نکالنا

دیکھو نکالا میں نے ہے مفہوم کچھ الگ
تم کچھ الگ سے بات کا مطلب نکالنا

تجھ سے تو جیت جاتا پر ہارا ہوں جان کر
اے یار! کچھ تو مات کا مطلب نکالنا

اخبار میرے عہد کا لکھتا ہے سچ کہاں
کچھ اور واردات کا مطلب نکالنا

سروؔر وفا خلوص کیا اس کا ہی نام ہے
اپنی ضروریات کا مطلب نکالنا

❋❋❋

خطاب عالم شاذؔ

"Osman Manzil" H/No. 387/1/166, Sthir Para Road
Dist. North 24 Parganas, Kankinara - 743126
(Mob. 8788536722)

سوئے منزل میں چلا ہوں تجھ کو آنا ہے تو آ
منزلِ مقصود تجھ کو ایک پانا ہے تو آ

خواب کی تعبیر ملتی ہے مسلسل جہد سے
ہاں! حقیقت خواب اپنا کر دکھانا ہے تو آ

دیکھتا ہوں جس طرف ساحل نظر آتا نہیں
میری کشتی ہے بھنور میں گر بچانا ہے تو آ

عاشقوں کی محفلوں میں عاشق و معشوق ہیں
ایسے میکش سے اگر واقف کرانا ہے تو آ

ہم جئیں گے یا مریں گے ایک دوجے کے لئے
وعدۂ فردا کیا تھا ، وہ نبھانا ہے تو آ

میں نے آنکھوں کو سجایا ہے تمہارے نام سے
بانکی چتون سے اگر سرمہ چرانا ہے تو آ

آ مرے محبوب آ ، بجھنے لگا دل کا دیا
بجھتے دل کے اِس دیئے کو گر جلانا ہے تو آ

آ خودی کو جان کر اور شاذؔ کا بن رہ گزر
درگزر کر گزرے کل کو ، کل بنانا ہے تو آ

❋❋❋

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ

"Nasim Colony" Pagmal, Hazaribagh - 825301 (Mob.9113750958)

غزل

یہ سچ ہے اس کی حقیقت سے آشنا بھی نہیں
نہ جانے کب سے ہے پوشیدہ یہ پتہ بھی نہیں

میں کب سے تیرے تصور کا ہوں چراغ لئے
اگر جلا یہ نہیں تو کبھی بجھا بھی نہیں

میں تیرے کربِ مسلسل کو کس طرح سہ لوں
کبھی تو قرب کی خوشیوں سے میں ملا بھی نہیں

تمہارے گھر میں ہیں خوشیاں ہمارے گھر میں ہے کیا
ہمارے ہونٹ تبسم سے آشنا بھی نہیں

ہر ایک روز میں خوشدلؔ حساب کرتا ہوں
تری نظر سے میں اب تک مگر بچا بھی نہیں

❁❁❁

مسلم نوازؔ

C/o Baitul Kasim, 12/3/H/1 Patwar Bagan Lane, Kolkata - 700009 (Mob. 8420850620)

غزل

چلتے چلتے مڑ کر دیکھا مت کرنا
اس کی جانب اپنا چہرہ مت کرنا

بنتے بنتے بات بگڑ بھی سکتی ہے
ان سے ملنا لہجہ تیکھا مت کرنا

سن ، میں تجھ کو بات پتے کی کہتا ہوں
اپنے قد کو سب سے اونچا مت کرنا

قائم رکھنا ہے تجھ کو اپنی پہچان
بھیڑ میں رہ کر خود کو تنہا مت کرنا

گھر سے نکلے ہیں تو واپس آئیں گے
رو کر اپنی آنکھ کو دریا مت کرنا

وہ آوارہ کس رستے سے گزرے گا
گھر سے جب نکلے تو پیچھا مت کرنا

آج یہاں کل اور کہیں مسکن ہوگا
اس کی خاطر اتنا سوچا مت کرنا

❁❁❁

رونقؔ خلیقی

C/o Jalaluddin Bharnewale, Behind Unique Medical Store, Near Do Bhai Bidi Fectory,
Burhanpur- 450331 (M.P.) (Mob. 9827012110)

غزل

من کی جو بات ہے محفل میں نمایاں کر دوں — یعنی خوشیوں سے مزین دلِ ویراں کر دوں
سر کو ٹکرا نہ یوں دیوانوں کے مانند اے دوست — ہم نشیں آ ، میں ترے درد کا درماں کر دوں
تیری تسکیں کے لئے ہاں تری تسکیں کے لئے — کون سا کام بتا اے دلِ ناداں کر دوں
میرے نغموں کو عطا نور وہ کر دے یا رب — شب کی ظلمت کو بھی دم بھر میں درخشاں کر دوں

گر جو توفیق دے اللہ مجھے اے رونقؔ
اپنے دشمن کو بھی انگشت بدنداں کر دوں

❁❁❁

انجینئر وسیمؔ اورنگ آبادی

Lecturer, Maulana Azad Engineering College, Patna (Mob. 9334520362)

غزل

جو رکھتے تھے خود کو سبھی سے چھپا کر — نظر والوں کی ہر نظر سے بچا کر
جو آتے تھے پیغام تیر نظر کے — تو لیتے رہے لطف نظریں جھکا کر
وہ ہاتھوں میں دل اب لئے پھر رہے ہیں — محبت کا خود کو مسیحا بنا کر
ابھی عمر ہے صرف پچپن برس کی — ہتھیلی پہ رکھتے ہیں دل کو سجا کر
ہیں سب راز کھولے تری شوخیوں نے — زمانے کو رکھا تھا سر پر اُٹھا کر

وسیمؔ اس نے دیکھا پلٹ کر نہ مجھ کو
وہی آج بیٹھے ہیں نظریں بچھا کر

❁❁❁

راحتؔ حسن
B-2, Old Naaz Residency, Sir Syed Nagar, Aligarh - 202002 (Mob. 9997198963)

غزلیں

تیرگی میں صبح کا منظر کہاں سے آ گیا
یک بیک دیوار میں یہ دَر کہاں سے آ گیا

لفظ کو جذبات کی جاگیر کیسے مل گئی
مفلسوں کے پاس اتنا زر کہاں سے آ گیا

نفرتوں میں چاہتوں کا راستہ کیسے کھلا
دشمنوں کے درمیاں دلبر کہاں سے آ گیا

بے خودی میں جانے کیسے روح زخمی ہو گئی
اس طرف پھینکا ہوا پتھر کہاں سے آ گیا

حوصلہ اپنی شجاعت کا صلہ پانے کو ہے
لوٹ کر بھاگا ہوا لشکر کہاں سے آ گیا

میں سفر کی سمت کا خود فیصلہ کرنے لگا
اب مری امداد کو رہبر کہاں سے آ گیا

ہر گھڑی راحتؔ کوئی مجروح کرتا ہے مجھے
وہم کا خنجر مرے اندر کہاں سے آ گیا

❁❁❁

اداکاری میں کچھ کم تر رہے ہیں
سو خمیازہ اسی کا بھر رہے ہیں

فلک کی سمت سیدھی ہیں اُڑانیں
زمیں پر پاؤں الٹا دھر رہے ہیں

ہماری منزلیں آگے ہیں اور ہم
سفر پیچھے کی جانب کر رہے ہیں

غبارِ منتشر بتلا رہا ہے
یہاں پر بے گھروں کے گھر رہے ہیں

جہاں پر خود کشی ممکن نہیں ہے
وہاں بے موت کے سب مر رہے ہیں

ہمارے خوف کا عالم نہ پوچھو
خدا کا نام لیتے ڈر رہے ہیں

وہ ہم کو اجنبی لگتے ہیں راحتؔ
ہمارے ساتھ جو اکثر رہے ہیں

❁❁❁

محمد مکرم حسین ندوی خادمؔ

Director Modern Welfare Academy, Sultanganj, Patna - 800006 (Mob. 8789349602

غزل

عہد فرقت میں ترا نام لئے جاتے ہیں
بیٹھ کے چاک گریبان سئے جاتے ہیں

جن کو بے لوث محبت سے نوازا میں نے
زخم پہ زخم وہی مجھ کو دیئے جاتے ہیں

تم کو جتنا بھی ستانا ہے ستاؤ ہم کو
ہم ہدایت کی دعا تم کو دیئے جاتے ہیں

تم تو نادانی پہ نادم ہی نہیں ہو اب تک
ہم تو انجام سے آگاہ کئے جاتے ہیں

کون اپنا ہے پرایا ہمیں معلوم نہیں
ہم تو دشمن پہ بھی احسان کئے جاتے ہیں

اپنے دل پہ جو گزرتی ہے وہ تم کیا جانو
بس اسی حال میں مر مر کے جئے جاتے ہیں

ہوگا انجام ترا کتنا برا کس کو خبر
تجھ کو خادمؔ یہی پیغام دیئے جاتے ہیں

اشعار پروین شاکرؔ

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

تتلی سے مرا پیار کچھ ایسے بھی بڑھا ہے
دونوں میں رہا لذتِ پرواز کا رشتہ

ترے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی ، کسے مناؤں گی

پہاڑ دن کی اذیت میں کتنی شدت ہے
اُجاڑ رات کی تنہائی کیا قیامت ہے

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے ، مگر بات ہے رسوائی کی

کوئی سوال جو پوچھے ، تو کیا کہوں اُس سے
بچھڑنے والے سبب تو بتا جدائی کا

میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر اے خدا لگ گئی
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بددعا لگ گئی

شام بھی ہوگئی ، دُھندلا گئیں آنکھیں بھی مری
بھولنے والے میں کب تک ترا رستہ دیکھوں

لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں، سکھ اُس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

یہی غنیمت ہے کہ بچے خالی ہاتھ نہیں ہیں
اپنے پرکھوں سے دُکھ کی میراث تو لیتے ہیں

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
جرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

نام کتاب	:	التفات واعتراف
مصنف	:	ڈاکٹر اویناش امن
ناشر	:	دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، دربھنگہ
اشاعت	:	۲۰۲۴ء
صفحات	:	۳۳۶ قیمت : ۴۰۰ روپے
مبصر	:	پروفیسر آفتاب اشرف

ڈاکٹر اویناش امن کی کتاب ''التفات واعتراف'' عطاؔ عابدی کی حیات اور فن پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب ہے۔ ڈاکٹر اویناش امن اردو زبان وادب سے متعلق اپنے مختلف کاموں کے سبب جانے جاتے ہیں۔ شعر وافسانہ کے علاوہ ترجمہ، تبصرہ اور تصنیف وتالیف میں ان کی دلچسپی قابل داد ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے قبل ان کی آٹھ کتابیں شعر و افسانہ اور ترجمہ وترتیب سے متعلق شائع ہو چکی ہیں۔

اویناش امن کی ایک بڑی خصوصیت اپنے رفیقوں اور بزرگوں کی خدمات کا اعتراف اور قدر وتحسین کا جذبہ ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی ترتیب واشاعت کا عمل ان کے اسی جذبہ کا مظہر ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں ڈاکٹر اویناش امن نے جہاں جناب عطاؔ عابدی سے اپنے رشتہ ورابطہ کو پرخلوص انداز میں پیش کیا ہے، وہیں عطاؔ عابدی کی شاعری اور تنقید وتحقیق کے مختلف گوشوں پر اختصار کے ساتھ، مگر خوبصورت اطوار سے روشنی ڈالی ہے۔ اسی دیباچہ میں کتاب ہذا کے چند ترتیبی رویوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مشمولہ مضامین اور ان کے مضمون نگاروں سے متعلق تعارفی اشاریے بھی پیش کئے گئے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے آغاز میں عطاؔ عابدی کی الگ الگ تصویر اور اس کے ساتھ ایک شعر بھی ہے۔ یہ شعر متعلقہ باب کے تناظر کی آئینہ داری کرتا نظر آتا ہے۔ پہلا باب ''نقوش وکوائف'' ہے۔ اس باب میں عطاؔ عابدی کی ذات وحیات سے متعلق مضامین ہیں۔ اس باب کا آغاز جس شعر سے ہوتا ہے اس سے عطاؔ عابدی کے شخصی احوال کی عکاسی ہوتی ہے، شعر یہ ہے ۔

ہم یوں ہی نہیں وقت کے سائے کے تلے ہیں
وہ پیڑ ہیں جو دھوپ کی صحبت میں پلے ہیں

دوسرا باب ''شعر وشناخت'' ہے۔ اس باب میں عطاؔ عابدی کی شاعری کے مختلف پہلوئی مضامین وتبصروں کے ذریعہ اجاگر ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ عطاؔ عابدی کی قلمی خدمات کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے۔ شاعری کے ذریعہ عطاؔ عابدی زمانہ سے زمانہ کا رشتہ قائم کرنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ غالبًا اسی سبب ڈاکٹر اویناش امن نے اس باب کا آغاز اس شعر سے کیا ہے ۔

جب قلم ہاتھ میں آیا تو عطاؔ ایسا لگا
اک ملاقات زمانے سے زمانے کی ہوئی

تیسرا باب ''عطاؔ عابدی کی صحافت اور تنقید وتحقیق'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں جو مضامین اور تبصرے شامل کئے گئے ہیں۔ اُن سے یہ حقیقت مترشح ہے کہ عطاؔ عابدی نے اپنی صحافت اور تنقید وتحقیق کے ذریعہ عصری تصویر وتعبیر دیکھنے اور دکھانے کی واضح کوشش کی ہے۔ اس باب کی پیش کش مرتب کتاب ہذا نے اس شعر سے کی ہے ۔

دکھائی ہے زمانے کی یہاں تصویر مدت تک
زمانہ یاد رکھے گا مری تحریر مدت تک

آخری چوتھا باب ''ادب اطفال'' ہے۔ عطاؔ عابدی نے بچوں کے لئے نہ صرف کہانیاں اور نظمیں لکھیں بلکہ معلوماتی مضامین اور دلچسپ کالم نیز اداریے بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان تحریروں میں بچپن کا منظرنامہ شدت سے اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب کا آغاز اس شعر سے کیا گیا ہے ۔

بچپن ہمارا اب بھی روشن ہے ایسا جیسے
اک دیپ جل رہا ہے گاؤں کی جھونپڑی میں

واضح ہو کہ مذکورہ اشعار خود عطاؔ عابدی کے شعری مجموعے سے لئے گئے ہیں۔ یہاں باب وارشعر کی پیش کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ مرتب کے ذریعہ ترتیب دی گئی اس کتاب میں عام روش سے الگ راہ اپنانے کی جو کوشش ہوئی ہے، وہ بہرحال ان کی تنوع پسندی ظاہر کرتی ہے۔

کتاب میں شامل مضامین وتبصروں سے قارئین کو جہاں عطاؔ عابدی کی مختلف شخصی و ادبی اور نظریاتی جہات سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے وہیں یہ حقیقت بھی اجاگر ہوتی ہے کہ مختلف فکرونظر کے حامل اہل قلم نے نہ صرف عطاؔ عابدی کو جانا پہچانا اور پڑھا ہے بلکہ اپنی اپنی معلومات اور مطالعے کی بنیاد پر التفات واعتراف کا مخلصانہ اظہار بھی کیا ہے۔ اظہار کرنے والوں میں جہاں بزرگان ادب شامل ہیں، وہیں ان بزرگوں کے بعد کی نسل کے قلم کار بھی موجود ہیں، مثلاً پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر اویس احمد دوراںؔ، ناوکؔ حمزہ پوری، پروفیسر کوثر مظہری، سلیم انصاری، ڈاکٹر محسن رضا رضوی، ڈاکٹر مشتاق احمد، آفاق عالم صدیقی، ثناء اللہ ثناؔ دوگھروی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر احسان عالم اور ڈاکٹر منصور خوشتر وغیرہ۔ واضح ہو کہ کتاب میں باون قلم کاروں کے مضامین اور تبصرے شامل ہیں۔

زیر نظر تبصرے کی ابتدا میں میں نے اوینا ش امن کے ذریعہ اپنائے گئے پرخلوص رویوں کا ذکر رشتہ ورابطہ کی خوبصورتی کے طور پر کیا ہے، جن کا واضح ثبوت کتاب میں شامل ''اپنی بات'' سے ملتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو، جس میں نہ صرف التفات واعتراف کی روشن ادا ملتی ہے، بلکہ اعتبار واعتماد کی خوشگوار فضا کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اوینا ش امن لکھتے ہیں:

> ''اگر میں چند بڑی شخصیات کا نام لوں جن کی وجہ سے میری زندگی میں نمایاں تبدیلی آئی تو ان میں سے ایک نام یقینی طور پر عطاؔ عابدی کا ہوگا۔ ان برسوں میں ہمارے رشتے کی بہت سی جہتیں رہیں۔ انہوں نے کبھی بڑے بھائی کی طرح میری محافظت کی، کبھی استاد کی حیثیت سے ہدایت کا راستہ دکھایا تو کبھی دوست بن کر سیر وتفریح بھی کی۔ میں ایک اکیلے شخص میں اتنے رشتے ان کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھتا۔''

جہاں تک کتاب میں شامل مضامین کا تعلق ہے، ان سے عطاؔ عابدی کی حیات اور فن کے غالب اور روشن حوالے اجاگر ہوتے ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کی نظر میں عطاؔ عابدی کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تجربوں کی گرمی نرم لہجہ میں پیش ہوتی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کے نزدیک عطاؔ عابدی کے یہاں شعری تصور بالیدہ ہے۔ ظہیر غازی پوری عطاؔ عابدی کو بالیدہ نظر غزل گو اور ڈاکٹر محبوب راہی حق جواز شاعر قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر کوثر مظہری کو عطاؔ عابدی کی شاعری میں زندگی کی تفہیم کے راستے ملتے ہیں۔ شاعری اور تنقید میں فعال رہنے کے سبب عطاؔ عابدی کو ڈاکٹر مشتاق احمد نے جہاں تخلیق وتنقید کا استعارہ لکھا ہے، وہیں آفاق عالم صدیقی نے شاعری کے حوالے سے عطاؔ عابدی کو کشادگی اور خود احتسابی سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر انور ایرج کے مطالعے کا حاصل یہ ہے کہ عطاؔ عابدی عصری حسیت کی نئی تعبیرات وتاویلات کے شاعر ہیں تو سلیم انصاری شعری حوالوں سے عطاؔ عابدی کو زندگی زخم اور خواب کا شاعر ثابت کرتے ہیں۔ ماہر اقبالیات محمد بدیع الزماں ''بیاض'' کو علم وآگہی کی بیاض بتاتے ہیں۔

صحافت اور تنقید وتحقیق کے باب میں ڈاکٹر سید احمد قادری عطاؔ عابدی کی صحافتی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ظفر انور شکر پوری نے عطاؔ عابدی کی صحافتی وادبی صلاحیتوں کے اعتراف میں تفصیلی مضمون لکھا اور اپنی دو کتاب ''دہلی کے پچاس صحافی'' (۲۰۱۵ء) اور ''بہار و بنگال کے صحافی'' (۲۰۱۶ء) میں اسے شامل کیا۔ یہ مضمون زیر تبصرہ کتاب میں بھی شامل ہے۔ عطاؔ عابدی کی تنقیدی وتحقیقی کتابوں کے حوالے سے ثناء اللہ ثناؔ دوگھروی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، پروفیسر محفوظ الحسن، ڈاکٹر نسیم اختر، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، انوارالحسن

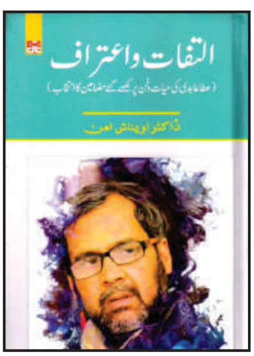

وسطوی اور ڈاکٹر اوینا ش امن نیز دیگر کئی حضرات نے عطؔا عابدی کے تنقیدی شعور اور جہات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادب اطفال کے باب میں ڈاکٹر حافظ کرناٹکی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اور ڈاکٹر خان رضوان نے اپنا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ دیگر کئی قلم کاروں کے مضامین، تبصرے بھی شامل ہیں اور خوب ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوینا ش امن کی کتاب ''التفات واعتراف'' عطاؔ شناسی کی راہ میں بہت اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید قوی ہے کہ ''التفات و اعتراف'' کے مضامین قارئین کے لئے معلوماتی اور مفید ثابت ہوں گے اور عطؔا عابدی کی ذات و خدمات کو سمجھنے سمجھانے کے لئے یہ کتاب بیحد معاون ثابت ہوگی۔

نام کتاب	:	تاثرات
مصنف	:	انوارالحسن وسطوی
ناشر	:	المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر، دربھنگہ
اشاعت	:	۲۰۲۴ء
صفحات	:	۲۸۰ قیمت : ۳۰۰ روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ**

انوارالحسن وسطوی اردو ادب میں کسی تعارف کے دست نگر نہیں۔ وہ ایک ادیب، ایک مبصّر اور اردو تحریک کے مجاہد کے طور پر اپنی حیثیت مستحکم کر چکے ہیں۔

پیش نظر کتاب ''تاثرات'' (کتابوں پر اظہار خیال) موصوف کی تازہ کتاب ہے، جس میں تبصرے ہی تبصرے ہیں۔ اس سے قبل ان کی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پیش نظر کتاب ''تاثراتے'' جیسا کہ کہا گیا تبصراتی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں پچاس کتابوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس سے قبل بھی ساٹھ کتابوں پر موصوف کے تبصروں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ یعنی اب تک ایک سو دس کتابوں پر ان کے تبصرے دو مجموعے کی صورت میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے تبصرے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پوری کتاب پڑھ کر تبصرہ کرتے ہیں اور خاص طور سے کسی بھی کتاب کے مثبت پہلوؤں کو اپنے مطالعے کا حصہ بناتے ہیں۔

مصنف موصوف نے زیر نظر کتاب کو دس ابواب یعنی دس گوشے میں موضوع اور صنف کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ پہلا گوشہ ''گوشۂ قرآن کریم'' کے نام سے شروع ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر سید شاہ حیدر رضوی کی کتاب ''قرآن پاک کی اردو تفاسیر: ایک مطالعہ'' کے عنوان سے مبصر موصوف نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر سید شاہ حیدر رضوی کی پیش نظر تصنیف 'قرآن پاک کی اردو تفاسیر' اردو زبان میں تفسیری خدمات کا بہترین جائزہ ہے۔ یہ کتاب نہ صرف دینی نقطہ نظر سے استفادے کی چیز ہے بلکہ اس کی ادبی ولسانی حیثیت بھی مسلم ہے۔'' (تاثرات، ص ۲۰)

دوسری کتاب ڈاکٹر اختر عادل گیلانی کی ''قرآن کریم سے مکالمہ'' ہے۔ مبصر موصوف اس کتاب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''زیر نظر کتاب 'قرآن کریم سے مکالمہ' کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب بیک وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہے اور یکجا ہے...... بلا شبہ یہ کتاب اردو دانوں کے ساتھ ساتھ غیر اردو دانوں کے لیے بھی مشعل راہ کا کام کرے گی۔'' (تاثرات، ص ۲۳)

دوسرا ''گوشۂ نعت پاک'' ہے۔ اس گوشے کے تحت چار کتابوں یعنی قوسؔ صدیقی کی کتاب ''نقش تاب''، پروفیسر فاروق احمد صدیقی کی کتاب ''ازہار مدینہ''، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''نبیوں میں تاج والے'' اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی کی کتاب ''چمنستانِ نعت'' پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ''نقش تاب (مجموعہ حمد و نعت شریف): ایک مطالعہ'' کے تحت مبصر لکھتے ہیں:

> ''قوسؔ صدیقی اپنے شعری سفر کے آغاز سے ہی کسی خاص تحریک یا رجحان کے پیروکار نہیں رہے۔ انہوں نے اپنی راہ خود منتخب کی ہے۔ انہوں نے گرچہ جا بجا اپنے کلام میں اجنبی الفاظ استعمال کئے ہیں جو لغت میں نہیں ملتے پھر بھی ان کے استعارے اور لفظوں کا انتخاب اتنا نیا

اور انوکھا ہے کہ قاری کو قدم قدم پر جدت و ندرت کا احساس ہوتا ہے۔'' (تاثرات،ص۲۶)

پروفیسر فاروق احمد صدیقی کا نعتیہ مجموعہ ''ازہار مدینہ: ایک مطالعہ'' میں اپنے مطالعہ کے بعد لکھتے ہیں:

''پروفیسر فاروق احمد صدیقی ایک صالح فکر شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔'' (تاثرات،ص۳۲)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں کا مجموعہ ''نبیوں میں تاج والے: ایک تعارف'' میں مبصر موصوف لکھتے ہیں:

''نبیوں میں تاج والے' میں شامل نعتیں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور ایک عاشق رسول ہونے کی آئینہ دار ہیں......مجموعہ میں شامل نعتوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نعتیں دقیق الفاظ اور پیچیدہ انداز بیان سے بالکل پاک ہیں۔''

(تاثرات،ص۳۸)

اس گوشے میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی کی دوسری تصنیف ''چمنستانِ نعت: ایک مطالعہ'' میں مبصر موصوف لکھتے ہیں:

''زیر تذکرہ کتاب 'چمنستان نعت' پروفیسر فاروق احمد صدیقی کی آٹھویں تصنیف ہے جس میں موصوف نے بیسویں صدی کے اردو کے مشاہیر نعت گو شعرا کی نعتوں کا نمائندہ انتخاب پیش کیا ہے جو اچھا خاصا تحقیقی کام ہے۔'' (تاثرات،ص۴۱)

اس کتاب کا تیسرا گوشہ ہے ''گوشۂ تحقیق وتنقید'' اس گوشے میں کل پندرہ کتابیں ہیں جن پر انوار الحسن وسطوی نے تبصرہ کیا ہے جو اس طرح ہیں:

''پروفیسر نجم الہدیٰ کی کتاب 'تنقیدی مسئلے'، 'اکبر رضا جمشید کی کتاب اُردو شعرا کی حب الوطنی' ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی کتاب 'دُردِتہ جام' ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی کتاب 'شفیع مشہدی کے افسانے' پروفیسر ابو منور گیلانی کی کتاب 'ارشد تلامذۂ شادؔ' مولانا ابوالکلام قاسمی کی کتاب 'بہار کی اردو شاعری میں علما کا حصہ' ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب 'گیسوئے اسلوب' سید محمود احمد کریمی کی کتاب 'زاویۂ نظر کی آگہی' ڈاکٹر عطا عابدی کی کتاب 'آزادی کے بعد بہار کے ادبی رسائل' ڈاکٹر منصور خوشتر کی کتاب 'طرزِ اظہار' ڈاکٹر عطاء اللہ خاں علوی کی کتاب 'ظفر پیامی کا تخلیقی سفر' ڈاکٹر راحت حسین کی کتاب 'مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی اور ان کی ادبی خدمات' کامران غنی صبا کی کتاب 'منصور خوشتر: نئی صبح کا استعارہ' منیر سیفی کی کتاب 'گفتگو کتابوں سے' اور ڈاکٹر لطیف احمد خاں کی کتاب ''عزیز بگھروی: ایک انقلابی شاعر''

مذکورہ کتابوں پر مبصر موصوف کے کئے ہوئے تبصروں کا تذکرہ بخوف طوالت نہیں کر رہا ہوں۔ ان کتابوں سے مبصّر کے مطالعے کی کشادگی اور وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے بعد چوتھا گوشہ ہے ''گوشۂ مونوگراف ورسائل'' اس گوشے میں ڈاکٹر ریحان غنی کی کتاب ''پروفیسر عبدالمغنی'' (مونوگراف شائع کردہ اردو ڈائرکٹوریٹ، پٹنہ) پر تبصرہ کے علاوہ بہار یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے اشاعت یافتہ ''اردو جریدہ'' کے ''کلیم عاجز نمبر'' پر بھی تبصرہ ہے، جسے پروفیسر توقیر عالم نے ترتیب دیا ہے، پھر ڈاکٹر منصور خوشتر کے ''دربھنگہ ٹائمز'' کے ''یادرفتگان نمبر'' اور ''مناظر عاشق ہرگانوی نمبر'' پر تبصرے بھی اس حصہ میں موجود ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے جو ''ادبی جرنل ۲۰۲۳'' ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ کے شعبۂ اُردو کی جانب سے شائع کیا ہے، اس پر بھی تبصرہ حاضر ہے اور ادبی رسالہ ''ثالث'' کے شمارہ ۲۷ پر بھی، جس کے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد ہیں۔ اس طرح اس حصہ میں مونوگراف ورسائل ملاکر کل سات کتابوں پر تبصرے ہیں۔

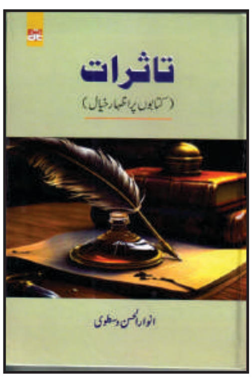

پانچواں ''گوشۂ شاعری'' ہے۔ اس میں پانچ شعری مجموعے پر

جناب وسطوی کے تبصرے ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

''اثر فریدی کا شعری مجموعہ 'سمندر بانٹتا ہے' بدر محمدی کا 'ہم عصر شعری جہات' نسرین اظہری کا 'گلستانِ غزل' اور مظہر وسطوی کا 'پئے تفہیم'۔''

کتاب کا چھٹا گوشہ ''گوشۂ یادِ رفتگاں و قائساں'' ہے۔ اس میں مبصر موصوف کے چھ تبصرے ہیں، جن میں ڈاکٹر اسلم جاوداں کی کتاب ''مردِ صحافت: شمس الہدیٰ استھانوی'' مولانا قمر عالم ندوی کی کتاب ''ضیائے ولی'' محمد شکیل استھانوی کی کتاب ''نقوشِ حیات'' ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ کی کتاب ''محبّ اردو حمید انور اور بک امپوریم'' ڈاکٹر مظاہر الحق کی کتاب ''جب جب وہ یاد آئے'' اور مولانا محمد نظر الہدیٰ قاسمی کی کتاب ''کتابِ زندگی'' شامل ہے۔

زیر نظر کتاب کا ساتواں گوشہ ''گوشۂ ادبِ اطفال'' ہے۔ اس گوشے میں ڈاکٹر عطا عابدی کی کتاب ''بچوں کی کتابیں: تعارف و تذکرہ'' ڈاکٹر احسان عالم کی کتاب ''بچوں کے سنگ'' ڈاکٹر منصور خوشتر کی کتاب ''بہار میں بچوں کا ادب کل اور آج'' اور ڈاکٹر احسان عالم کی دوسری کتاب ''آؤ بچو تمہیں بتائیں'' پر مبصر کے سیر حاصل تبصرے ملتے ہیں۔

آٹھواں گوشہ ''گوشۂ مصاحبہ'' ہے۔ اس گوشہ میں مبصر کے قلم سے تین کتابوں پر تبصرے ہیں۔ یہ کتابیں انٹرویو کا مجموعہ ہیں۔ پہلی کتاب نثار احمد صدیقی کی ''انطباق'' ہے۔ دوسری کتاب انور آفاقی کی ''دُوبدو'' اور تیسری کتاب ''اکبر رضا جمشید: کثیر الجہت شخصیت'' ہے، جس کے مرتب ڈاکٹر اے۔ کے۔ علوی ہیں۔ انٹرویو کی ان کتابوں کا جائزہ بھی عمدہ انداز میں لیا گیا ہے۔

نواں گوشہ ''گوشۂ صحافت'' ہے، جس میں صرف مشہور صحافی سہیل انجم کی کتاب ''جدید اردو صحافت کا معمار: قومی آواز'' پر تبصرہ ہے۔ مبصر اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب 'جدید اردو صحافت کا معمار: قومی آواز' مذکورہ اخبار کی صحافتی تاریخ کی جامع دستاویز ہے۔ سہیل انجم نے گرچہ صرف ۱۳ سال ہی 'قومی آواز' کے شعبۂ ادارت میں گزارے جسے لمبی مدت نہیں کہا جا سکتا ہے، اس کے باوجود انہوں نے 'قومی آواز' پر کتاب تصنیف دینے کا کام کیا، یہ ان کا قابلِ قدر اور قابل ستائش کارنامہ ہے۔'' (تاثرات، ص ۲۴۹ و ص ۲۵۰)

دسواں اور آخری گوشہ ''گوشۂ متفرقات'' ہے، جس میں کل چھ کتابوں پر تبصرے ہیں۔ اس میں مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کی کتاب ''آدھی ملاقات'' ڈاکٹر منصور احمد اعجازی کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' مولانا شمشاد رحمانی کی کتاب ''جنرل نالج'' الحاج محمود عالم کی کتاب ''ازدواجی زندگی'' مولانا صدر عالم ندوی کی کتاب ''مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی: نقوش و تاثرات'' اور آخری کتاب ''بیکٹیریا سے وھیل تک'' ہے جو اشرف عظیم آبادی کی تصنیف ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''تاثرات'' کے مصنف نے اپنی کتاب کا انتساب ان لفظوں میں کیا ہے:

''ان صحافیوں کے نام جو میری تحریروں کو اپنے اخبارات یا رسائل میں جگہ دے کر مجھے ممنون کرتے ہیں۔''

مصنف موصوف اپنی کتاب کے پیش لفظ میں تحریر کرتے ہیں:

''جہاں بہت سارے ادبا شعرا اور محققین میری تحریروں کے مداح ہیں، وہیں دوسری جانب کچھ دوسرے نامور ادبی پارکھوں اور ناقدوں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں کسی کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کے مندرجات کی غلطیوں کی نشاندہی نہیں کرتا ہوں، جس کے سبب کتاب کا منفی رُخ سامنے نہیں آپاتا ہے اور تبصرے کا حق ادا نہیں ہوتا ہے۔ ناقدین ادب کی یہ شکایت بالکل بجا ہے۔ میں اپنی اس کمی کا خود اعتراف کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرا موقف یہ ہے کہ میں گلستاں کی سیر پھولوں کے حسن، اس کی رنگینی اور اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لئے کرتا ہوں۔ کانٹوں کی تلاش کے لیے نہیں۔'' (تاثرات، ص ۱۰ و ص ۱۱)

پیش لفظ کے بعد ''تاثر'' کے عنوان سے شفیع مشہدی کی تحریر ہے، جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ:

''انوار الحسن وسطوی صاحب کی کتاب 'تاثرات' ایک

تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور جب بھی اُردو میں تبصرات کے موضوع پر گفتگو ہوگی اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔'' (تاثرات،ص۱۳)

''استقبال'' کے عنوان سے پروفیسر علیم اللہ حالی فرماتے ہیں:

''یہ اچھی بات ہے کہ جناب انوارالحسن وسطوی نے پیش نظر کتاب میں بالعموم نئی مطبوعات کا تعارف پیش کیا ہے۔صرف تعارف ہی نہیں بلکہ ان کے مشتملات پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے اور یوں انہوں نے ہم عصر مطبوعات میں ادبی وعلمی مباحث پر اپنے تفصیلی تاثرات بیان کرکے ان کو گراں قدر بنا دیا ہے۔ ان کے یہ تاثرات عصر حاضر کی دانشوری کی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (تاثرات،ص۱۴اوص۱۵)

زیرنظر کتاب کے بارے میں میں نے اپنے خیالات پر تبصروں سے اقتباسات اور اہل نظر وصاحب کتاب کی آرا کو ترجیح دی ہے تا کہ کتاب کی نوعیت وافادیت بہتر طریقہ سے کھل کر، پڑھنے والوں کے سامنے آئے اور ضمناً یہ بھی اندازہ ہوجائے کہ ''تاثرات'' کے تاثرات محض رسمی نہیں ہیں ، بلکہ وہ زیر تبصرہ تصانیف کے لئے ایک عمدہ قسطاسیہ کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ نہ صرف معنوی بلکہ صوری لحاظ سے بھی انوارالحسن وسطوی کی یہ کتاب متوجہ کرتی ہے اور امید قوی ہے کہ باذوق پڑھنے والوں کے حلقے میں اس کا خاطرخواہ استقبال ضرور ہوگا۔

نام کتاب	:	آئینہ در آئینہ (شعری مجموعہ)
شاعر	:	بشّر رحیمی
ناشر	:	فرید بک ڈپو، نئی دہلی
صفحات	:	۲۳۰
مبصر	:	ثناء اللہ ثنا دوگھروی

غزل اردوشاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔خاص طور سے عہد حاضر میں دیگر اصناف سخن کے مقابلے غزل کی جانب شعرائے کرام کی توجہ زیادہ ہورہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان دنوں غزل کی دنیا میں شعرا کا ایک ہجوم سا نظر آتا ہے۔اس ہجوم میں بہت سے شعرا ایسے بھی ہیں جن کی شاعری کا اگر مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے کہ وہ محض تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں ،لیکن اس کے برعکس بہت سے شعرا ایسے ہیں جو غزل کی زلف گرہ گیر سنوارنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں اور ان کی شاعری قارئین ودانشوران ادب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، معاشرے کو بہت کچھ ملتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی شاعری اپنے عہد کی آواز ہوتی ہے اور قاری کے دل میں اُتر جانے کی صلاحیت سے معمور ہوتی ہے۔ایسے ہی شعرا میں بلا شبہ بشّر رحیمی کا بھی شمار کیا جائے گا جو شاعری کی دنیا میں اپنا مقام بنانے کی سمت میں تیز رفتاری سے گامزن ہیں۔ موصوف کے اس سفر اور سفر کے انداز سے بخوبی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر اسی طرح ان کا سفر جاری رہا تو بہت جلد وہ شاعری کی دنیا میں اپنی نئی شناخت قائم کرنے میں کامیاب وکامران ہوجائیں گے۔

پیش نظر کتاب ''آئینہ در آئینہ''بشّر رحیمی کا ایک خوبصورت شعری مجموعہ ہے، جس میں ایک حمد اور ایک نعت کے علاوہ ایک سو دو غزلیں شامل کی گئی ہیں جن سے ان کی شعری ریاضت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس سے قبل ۲۰۱۷ء میں موصوف کا پہلا شعری مجموعہ ''عکس ٹوٹے آئینے کا'' منظر عام پر آکر ادبی حلقے سے خراج حاصل کرچکا ہے۔ اُس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

''فن کی دنیا میں وہ فن کار تادیر زندہ رہتا ہے، جس کے فن میں اس کے عہد کی عکاسی ملتی ہے۔اسی طرح کے فنکاروں میں بشّر رحیمی کا بھی شمار کیا جائے گا۔'عکس ٹوٹے آئینے کا'بشّر رحیمی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ان کی شاعری کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے، مگر شاعری میں ان کے یہاں جو تیور پایا جاتا ہے وہ ان کے اچھے شاعر ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ بشّر رحیمی نے اپنی شاعری میں آج کی دوڑتی بھاگتی زندگی، شور، شرابے، مذہب وملت، اخلاقی اقدار، انسانیت، سیاست، آشناؤں کی ناآشنائی، اپنوں کے فریب، نیز انسانوں کی حیوانیت جیسے عوامل کو موضوع بنایا ہے، ساتھ ہی انہوں نے اپنی شاعری میں آج کے

سلگتے مسائل کو خصوصیت کے ساتھ جگہ دی ہے، جس سے شاعر کے مزاج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں خیالات میں جہاں تازگی پائی جاتی ہے وہیں بلند افکار و نظریات کے حامل اشعار بھی ان کے یہاں جا بجا ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عصری تقاضوں کا پوری طرح لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بشؔر رحیمی کے یہاں ثقیل الفاظ نہیں ملتے، ان کی شاعری میں سادگی ہے، ایک طرح کا ستھرا پن ہے۔ وہ سلیقے سے کسی خیال کو شعری قالب میں ڈھالنے کے فن سے واقف ہیں۔ ان کے کلام میں ایک طرح کی دلکشی اور دلآویزی ہے۔''

مذکورہ خیالات کے بیشتر حصے بشؔر رحیمی کے زیر نظر دوسرے مجموعہ پر بھی بطریق احسن منطبق ہوجاتے ہیں۔ مجموعہ ''آئینہ در آئینہ'' میں پہلے شاعر کے قلم سے ''آغازیہ'' کے عنوان سے ایک مضمون ہے، اس کے

بعد تاثرات اور تجزیاتی مضامین کا سلسلہ ہے، جس میں کل چھ دانشوران ادب کے تجزیاتی مضامین شامل ہیں، جن میں بشؔر رحیمی کی شاعری کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی شاعری کے خواص کو ڈھونڈ نکالنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان حضرات میں فاروق ارگلی، پروفیسر فاروق احمد صدیقی، پروفیسر علیم اللہ حالی، انوارالحسن وسطوی کے علاوہ پروفیسر ناظم قادری، ظفر انصاری ظفؔر اور ڈاکٹر ایم اظہار الحق اظہؔر شامل ہیں۔ یہ تمام کے تمام مضامین بشؔر رحیمی کی شاعری کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور موصوف کی شاعری میں پوشیدہ اسرار و رموز سے آشنا کرانے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔

بشؔر رحیمی نے اپنے مضمون ''آغازیہ'' میں اپنی شاعری کے حوالے سے بہت کچھ کہا ہے، ان میں سے ایک چھوٹا سا اقتباس دیکھئے:

''آپ یقیناً محسوس کریں گے کہ یہ غزلیں روایتی انداز میں محض گل و بلبل کے تذکرے بھی نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں کہیں بھی رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے کی جسارت یا حماقت کی گئی ہے، بلکہ ترجیحی اور شعوری طور پر 'آئینہ در آئینہ' وہ باتیں دکھائی گئی ہیں جو یہ گنہگار آنکھیں آج کے معاشرے میں ہر چہار سمت دیکھ رہی ہیں۔''

مذکورہ بالا سطور سے شاعری کے باب میں بشؔر رحیمی کا ادبی و شعری موقف بالکل واضح اور صاف ہوجاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح کی شاعری کی ہے اور اپنی شاعری میں کن کن چیزوں کو موضوعاتی اعتبار سے جگہ دی ہے، ان کی شاعری میں روایت کی پاسداری کا عنصر کہاں تک دیکھنے کو ملتا ہے اور عصری حسیت کی عکاسی کے حوالے سے ان کی شاعری کہاں تک ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

بشؔر رحیمی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف نے اپنے ''آغازیہ'' میں اپنی شاعری کے حوالے سے جو دعوے کیے ہیں، وہ یوں ہی ہوا میں نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ان کی شاعری میں جا بجا ان دعووں کا ثبوت موجود ہے۔

اسے بشؔر رحیمی کے کلام کی ایک خوبی ہی کہا جائے گا کہ انہوں نے اپنی شاعری کو زیادہ سے زیادہ اپنے عہد سے ہم آہنگ کرنے کی فن کارانہ اور مخلصانہ کوشش کی ہے، اس لیے انہیں اگر عصری حسیت کا شاعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ بشؔر رحیمی نے اپنی غزلوں میں اپنے احساسات و جذبات اور تجربات و مشاہدات، روز روز اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات و حادثات، لوگوں کی بے راہ روی، اپنوں کا کرب، غربت، مزدوروں کی بے بسی، رشتوں میں شکست و ریخت، انصاف کی طرح طرح سے پامالی، سیاست دانوں کی سیاسی بازی گری، آپسی چپقلش، نئی نسل کی فیشن پرستی، جنسی استحصال، قتل و غارت گری، زوال آمادہ تہذیب، شرانگیزی، آپسی منافرت، فرقہ بندی فتنہ و فساد جیسے سیکڑوں موضوعات کو سیدھے سادے الفاظ میں بڑے کچھ ایسے سلیقے سے پیش کیا ہے کہ قاری ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد ٹھہر کر سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

سچ کو ہے جھوٹ بنانے میں مہارت ان کو
وہ ہیں بے چین حقیقت کو بدلنے کے لیے

جہاں سے لوگوں کو نفرت کا ذہن ملتا ہے
ہمارے شہر میں ایسا بھی اک ادارہ ہے

کبھی فرصت ملے تو یہ بھی سوچو
بہو کیوں نذر آتش ہو رہی ہے

کچھ ایسا ہوا آج تماشہ مرے آگے
جھوٹے کو بتایا گیا سچا مرے آگے

جانے کیسا یہ دور آیا ہے
بولتا ہے پسر ، پدر خاموش

مذکورہ بالا اشعار پر ایک نظر ڈالنے سے بشؔر رحیمی کی شاعری کی سمت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ بشؔر رحیمی کی شاعری صالح اقدار پر مبنی شاعری ہے، جس میں فضولیات کے لئے کہیں کوئی جگہ نہیں ہے، مزید یہ بھی کہ ان کے کلام میں جہاں جدید لب و لہجے میں بات کہی گئی ہے وہیں ان کی شاعری میں روایت سے بھی انحراف نہیں کیا گیا ہے۔ بہتیرے اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو قاری کو ان کی شاعری میں روایت کی پاسداری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں سماجی اور اصلاحی مضامین کو شاعری کا حصہ بنایا گیا ہے، وہیں عشقیہ مضامین بھی ان کی شاعری کو شعری جمالیات سے آراستہ کرنے میں پیچھے نہیں۔ یعنی غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کی موجودگی بھی نظر آتی ہے۔ بالفاظ دیگر بشؔر رحیمی کی شاعری جدید اور روایتی شاعری کا حسین امتزاج ہے اور اس کا موصوف نے خود ہی اپنے کلام میں ایک جگہ اعتراف بھی کیا ہے ؎

روایت سے تعلق گر ہے میرا
تو جدت سے بھی میرا واسطہ ہے

بشؔر رحیمی فلسفیانہ افکار و نظریات کے چکر میں نہیں پڑتے اور نہ ہی ثقیل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کو صالح اقدار پر مبنی شاعری بنانے کی کوشش کی ہے اور اسی لیے عام لوگوں کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو سیدھے سادے الفاظ میں شعری قالب میں ڈھال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو سمجھنے کے لیے قاری کو زیادہ ذہنی ورزش نہیں کرنی پڑتی۔

بشؔر رحیمی کا یہ اختصاص ہے کہ وہ الفاظ کا برمحل استعمال کر کے بڑی چابک دستی سے اپنے اشعار کو معنوی حسن عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار قاری کے دل و دماغ میں پہلی فرصت میں ہی نہایت آسانی سے اُتر جاتے ہیں۔ اس طرح یہ بات وثوق سے کہی جائے گی کہ بشؔر رحیمی کا یہ مجموعہ ''آئینہ در آئینہ'' بھی گزشتہ مجموعہ ''عکس ٹوٹے آئینے کا'' کی طرح ادبی حلقے میں مقبول ہوگا اور اسے ہر سطح پر سراہا جائے گا اور وہ بہت جلد شاعری کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ان کی یہ کتاب ادبی حلقے میں ایک نئی دھمک کا اشاریہ ہے۔ ❋❋

کام کی باتیں

''کوئی بھی کام صرف ارادہ کرنے سے نہیں، محنت کرنے سے ہوتا ہے۔ ایمانداری اور محنت کے بغیر کوئی پھل حاصل نہیں ہوتا۔ جس کام کا ارادہ کرو اس کی جستجو میں لگے رہو، قدرت ایک دن کامیابی دے گی۔ قوت ارادی کے کمزور انسان کبھی بلندی پر نہیں پہونچ سکتے۔ بلندی پر وہی پہنچتا ہے جو ناکامی سے گھبراتا نہیں بلکہ سبق حاصل کرتا ہے۔ ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے لئے مستقل ارادہ ہی واحد راستہ ہے۔ ہمت اور حوصلے سے ہر قسم کی مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔ مخالفین سے بھی محبت اور اخلاق سے پیش آؤ، جو برتاؤ تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو اسے دوسروں کے لئے بھی پسند نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ تمہاری راہ میں کانٹے بچھاتے ہیں، بچھانے دو، تمہارے اخلاق کی قینچی ان کانٹوں کو کاٹ دے گی۔ اگر تمہاری محبت اور اخلاق کا بھی ان پر کچھ اثر نہ ہو تو سمجھ لو، آئینہ خراب ہے۔ خراب آئینے پر سورج کی شعاعیں بھی نہیں پڑتیں۔ تم بے خوف ہو کر اپنے کام میں لگے رہو، ممکن ہے ان کانٹوں پر ایک دن ان کو ہی چلنا پڑے۔ اخراجات پر بھی توجہ دینی چاہئے۔ چھوٹی سے چھوٹی فضول خرچی سے بھی بچنا چاہئے، وہ بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ نادان نہیں جانتا، کشتی میں چھوٹے سے چھوٹا سوراخ بھی ہو جائے تو وہ ڈوب سکتی ہے۔'' (یوسف دہلوی کی تحریر سے ماخوذ)

☆ ماہنامہ ''زبان وادب'' ستمبر ۲۰۲۴ء نظر نواز ہوا۔ شمارہ ظاہری ومعنوی اعتبار سے قابل رشک حد تک دیدہ زیب اور جالب فکر ونظر ہے۔ محمد شوکت جمال کا مضمون ''ذکر رسول اور قدیم دکنی شاعری'' بڑا چشم کشا مضمون ہے۔ اردو میں نعتیہ ادب کے ساتھ ہمارے نقادوں نے بڑی بے توجہی وبے التفاتی کا ثبوت دیا ہے اور یہی رویہ انہوں نے نعت گو شعرا کے ساتھ بھی روا رکھا ہے، حالاں کہ اس اثاثہ میں عام انسان، ان کے فکر وعمل، اخلاق وسیرت اور طرز زندگی کی تطہیر کے لئے جو صالح نقوش ملتے ہیں وہ دوسری شعری کائنات میں کہاں! پیش نظر مضمون دو درجن سے زائد دکنی شعرا کے نمونۂ کلام اور نوع بہ نوع روشن مضامین سے آراستہ ہے۔ اسی طرح محمد پرویز اختر کا مضمون ''شعرائے بہار کی رباعیوں میں ذکر رسالت مآب'' بھی خوب ہے۔ یہ حصہ قدیم وجدید شعرائے بہار کی مختلف النوع رباعیوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح آپ نے ان دونوں مقالوں کی شمولیت سے گویا ملک کے دو کناروں کی فکری تہذیب کا آئینہ دکھانے کی سعی جمیل کی ہے۔ رئیس الدین رئیسؔ نے اپنے مقالہ میں بھوپالی دانشور قمرؔ نقوی نقشبندی کی بے پناہ علمی وادبی صلاحیتوں سے روشناس کراتے ہوئے ان کے مقبول ترین ناولوں کا تجزیہ پیش کیا ہے، اس ضمن میں انہوں نے ممدوح کی دیگر تخلیقات وعلمی فتوحات کا جامع انداز میں تذکرہ بھی کیا ہے، جو علم وادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جناب رئیس کا شمار پرانے لکھنے والوں کی فہرست میں ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب تحریر سے ادیبانہ چاشنی صاف جھلکتی ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان کی ادبی تحریریں خود ان کی منفرد شناخت کا پتہ دیتی ہیں۔ انہوں نے فن ناول نگاری میں قمرؔ نقوی نقشبندی کے فنی اصولوں اور لوازمات کے ساتھ ان کی جدید تکنیک، انداز بیان، کردار نگاری، واقعہ بیانی، تمثیل کاری اور کہانی کے اچھوتے پن کو سراہا ہے اور مثال میں ان کے پہلے ناول ''پراسرار لفافہ'' کو پیش کیا ہے اور پھر ان کے دیگر مقبول ناولوں کی خوبیوں پر بھی گہرائی وگیرائی کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے اپنے مختصر مقالہ میں صحیح تلفظ کی نشاندہی کی ہے چونکہ اردو میں اعراب کا استعمال نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اکثر ذی علم اور اصحاب تقریر وتحریر سے بھی بسا اوقات تلفظ واملا میں غلطیاں سرزد ہوجاتی ہیں۔ یہ مقالہ افادیت سے خالی نہیں، لیکن لفظوں کی فہرست کے ساتھ ان کی تذکیر وتانیث اور معانی کا التزام بھی رکھا جاتا تو یہ مزید مفید ہوتا۔ ڈاکٹر ارشاد احمد کا مقالہ ''احسانؔ سیوانی: یادیں اور باتیں'' ایک عمدہ خراج عقیدت ہے۔ انہوں نے سلیقے سے احسانؔ سیوانی کی یادوں کو تازہ کیا ہے اور ان کے شاعرانہ اختصاص سے روشناس کرایا ہے۔ سلطان آزاد کا مقالہ بھی ایک عمدہ تحقیقی مقالہ ہے، جس میں داغؔ دہلوی اور ان کے بہاری شاگرد نسیمؔ ہلسوی کے تعلق سے بعض اہم اور دلچسپ تاریخی اور تنقیدی وتجزیاتی حوالے سمٹ آئے ہیں۔ ظفر امام کا مقالہ ''سوداؔ اور ان کا فارسی کلام'' بھی مفید ومعلوماتی ہے، مگر اس میں سوداؔ کے سوانحی، خاندانی ودیگر تذکرے اصل موضوع پر حاوی ہوگئے ہیں۔ عظیم انصاری نے اپنے مقالہ ''فراغؔ روہوی کی غزل گوئی'' میں ان کے شعری مجموعے ''ذرا انتظار کر'' اور ''در خواب پر دستک'' کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔ بلاشبہ ان کی غزلیہ شاعری کلاسیکی رچاؤ اور جدید لب ولہجہ کا سنگم کہلانے کا حق رکھتی ہے اور ان کو معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔ طلحہ نعمت ندوی نے مولانا مسعود عالم ندوی کی انشا پردازی کی خصوصیات کو موضوع بنایا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ زیبا راشد نے بھی اپنے مقالہ ''شاعر رومان: اخترؔ شیرانی'' میں موضوع کو ضروری جہتوں سے بخوبی نبھانے کی اچھی کوشش کی ہے۔ شاہد حسین نے الیاس احمد گدی کے مشہور ناول ''فائر ایریا'' پر اپنا مخصوص مطالعہ پیش کیا ہے جو محنت کشوں کی سسکتی بلکتی زندگی پر مبنی ہے اس میں کوئلوری کے غریب مزدوروں کے استحصال اور ان کے ساتھ ہونے والے ظلم وناانصافی کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ اس شمارے میں

تین افسانوں نے شمولیت کا جواز پایا ہے۔ آغاز ڈاکٹر مہتاب جہاں کے افسانہ ''عدل'' سے ہوتا ہے۔ یہ ایک مترجمہ کہانی ہے جس کا تعلق صادق چوبک سے ہے جو جدید فارسی میں ''داستانِ کوتاہ'' کے مایہ ناز و منفرد فن کار گزرے ہیں۔ انہوں نے اس افسانہ میں ایک زخمی گھوڑے کو کہانی کا کردار بنا کر اس کے اردگرد مکالموں اور مناظروں کے تانے بانے بنے ہیں جس سے فکر وعمل کے مختلف زاویئے سامنے آتے ہیں۔ ارشد منیم کا افسانہ ''سکھ'' بھی قابل مطالعہ رومانی افسانہ ہے۔ سچن اور پونم اس کے دو مرکزی کردار ہیں۔ اسی طرح منظر عالم کا افسانہ ''دھوکے باز'' بھی رومان ونفسیات سے تعلق رکھتا ہے، جس میں طارق اس کا دوست قاسم اور صبا تینوں مرکزی کردار ہیں۔ کہانی کا اختتام صبا کے ناعاقبت اندیش فیصلے پر ہوتا ہے۔ ''منظومات'' کا کالم ''کتابوں کی دنیا'' اور ''بچوں کا زبان وادب'' یہ سارے مشمولات بھی قابل مطالعہ ہیں اور تمام اہل قلم تحسین وستائش کے مستحق۔ رسالہ کی تزئین کاری اور حسن ترتیب میں آپ کی محنت وکاوش بول رہی ہے۔

عبدالرزاق پیکر رضوی، پٹنہ

☆ روضۂ رسول کے خوبصورت عکس، اخضری پس منظر، آیاتِ قرآنی کے حسین طغرے اور صلواۃ وسلام کے مضمون سے آراستہ خوش نویسی کے نمونے کے ساتھ، ستمبر ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' نظر نواز ہوا۔ بلاشبہ ربیع الاوّل کے مہینہ کی نسبت سے آپ نے خوب خوب صحافتی استفادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شمارے کا خاص حصہ تو ''ذکر رسول'' ہی کا حصہ ہے۔ اگر چہ اس کے تحت صرف دو ہی مقالے پڑھنے کو ملے، لیکن یہ اپنی اپنی جگہ یوں بہت ہی منفرد ہیں کہ ان میں موضوع کو خاص رُخ سے اُٹھایا گیا ہے اور بہت ہی کامیابی اور سنجیدگی سے برتا گیا ہے۔ دکنی شاعری کے متن اور اس پر لسانی وتاریخی اور تجزیاتی و تنقیدی رُخ سے مواد ومباحث کی یقیناً کمی نہیں ہے، لیکن مجھ جیسے قاری کو قدیم شعرائے دکن کے نعتیہ کلام پر اس طرح کے وقیع اور باحوالہ مضمون سے استفادے کا پہلی بار موقع ملا۔ بلاشبہ ''ذکر رسول اور قدیم دکنی شاعری'' میں جناب محمد شوکت جمال نے بہت ہی پرمغز تمہید کے ساتھ نفس موضوع کی ضروری جہتیں روشن کردی ہیں اور شرعی اعتراضات کے امکان کا پیشگی جواب بھی تشنۂ اظہار نہیں رکھا ہے، پھر جناب محمد پرویز اختر نے ''شعرائے بہار کی رباعیوں میں ذکر رسالت مآب'' کے موضوع پر بھی بہت عمدگی سے لکھا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مقالہ کے شروعاتی حصہ میں وہ موضوع سے ذرا دور ہوئے ہیں، مگر ان کی یہ دوری بھی مجھ جیسے قاری کو معلوماتی فائدے دے گئی۔ اس حصے میں وصلیوں کے عکوس کی شمولیت کا اہتمام بھی پسند آیا اور ''مدینہ'' کے عنوان سے دیا گیا فیبلر بھی، جو ہادی حسن خاں نایابؔ کی غزل سے ماخوذ ہے۔ زیرنظر شمارے کے ''مقالات'' کا حصہ بھی حسب روایت اچھی اچھی تحریروں پر مشتمل ہے۔ خاص طور سے یہاں وہ تحریر بہت ہی قیمتی اور مفید وقت ہے جو ڈاکٹر اسلم جاوداں نے ''صحیح اردو کیسے بولیں؟'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ تو اس زمانے میں اردو کے لئے ہزار آفتوں کی ایک ہی نہیں اس طرح دو گونہ آفت ہے کہ ایک طرف اردو لکھائی املا وانشا کے حوالے سے غلطیوں کی پوٹ بنتی جا رہی ہے اور دوسری طرف اردو کا تلفظ، سننے والوں کے سر پر ہتھوڑے برسانے میں ذرا بھی پیچھے نہیں رہ پا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو صفر کی طرح جزم کی ایجاد بھی انقلابی ایجاد تھی اور پھر اعراب سہ گانہ کے درست استعمال کا اہتمام وغیرہ، لیکن لاپرواہی حد سے سوا جڑ پکڑ چکی ہے اور اس پر توجہ اور اس کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ اس نوعیت کے مضامین رسالہ میں جگہ پاتے رہیں تو بہتر ہے۔ اس حصہ کے دوسرے مضامین بھی کچھ کم معیاری نہیں۔ نسیم عظیم آبادی پر سلطان آزاد کا مضمون ''مولانا مسعود عالم ندوی کی اردو انشا پردازی'' پر طلحہ نعمت ندوی کا مضمون اور پھر ''شاعر رومان: اختر شیرانی'' کے عنوان سے زیبا راشد کا مضمون کافی متوجہ کر گیا۔ ''افسانے'' کے تحت ''عدل'' نے بے حد متاثر کیا۔ ایک بڑے ایرانی فکشن نگار صادق چوبک کے اس افسانہ کا ترجمہ بھی ڈاکٹر مہتاب جہاں نے بہت سلیقہ سے کیا ہے کہ اردو متن پر ترجمہ کا گمان کم سے کم ہی ہوتا ہے۔ ارشد منیم کی کہانی ''سکھ'' اور منظر عالم کی کہانی ''دھوکے باز'' پر آپ نے ''حرف آغاز'' میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر بس رسمی اضافہ ہی ممکن ہے۔ ''منظومات'' کا حصہ بھی کامیاب ہے اور کتابوں پر

تبصرے بھی مختصر، مگر بے لاگ ہیں۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' میں نوازش خرم کا مضمون ''بجلی کی چمک، بادل کی گرج'' یقیناً ایک اچھا سائنسی طبیعاتی مضمون کہلانے کا حق رکھتا ہے تو سید تنویر احمد کا مضمون ''اچھے چال چلن کی برکت'' بھی تربیت اور ذہن سازی کے لحاظ سے کامیاب ہے۔ زیرِ نظر شمارے کے تمام قلم کاروں کو مبارکباد!

(ڈاکٹر) شائستہ خاتون، پٹنہ

☆ ''زبان و ادب'' سے استفادے کا برابر موقع ملتا رہتا ہے۔ شمارہ ستمبر ۲۰۲۴ء کی تزئین و آرائش دیکھ کر میں محوِ حیرت رہ گیا۔ ''ذکر رسول'' کے تحت دکنیات اور بہاریات دونوں جہتوں سے اس شمارے کو خصوصی اہمیت مل گئی ہے۔ شمارے کے دیگر نوع بہ نوع مشمولات کے مطالعہ سے بھی بڑی شادمانی حاصل ہوئی۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ رسالہ جامعات کے طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کے لئے بیحد نفع بخش ہے۔ پیش نظر شمارہ کے منظوماتی حصہ میں نئے چہروں کی شمولیت اچھی بات ہے۔ اس سے نئی نسلوں کی ادبی نشو و نما ہوتی ہے اور ان کی تشویق میں اضافہ بھی ہوتا ہے، یہاں فراقؔ جلال پوری، شاہدؔ اختر اور ڈاکٹر قدسیہؔ انجم علیگ کی غزلیں بہت پسند آئیں جو جدید لب و لہجہ اور کلاسیکی رنگ و آہنگ سے مزین ہیں۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' اپنے اخلاقی و نفسیاتی مواد کے اعتبار سے خوب تر ہے۔

کاظم رضا، نیو عظیم آباد، پٹنہ

☆ ''زبان و ادب''، ستمبر ۲۰۲۴ء ہمدست ہوا۔ مجلّہ کا سرورق اور پس ورق اور دونوں اندرونی سرورق بھی جاذبیت اور معنویت کے اعتبار سے دیدنی اور دلکش ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں ''حرفِ آغاز'' کے تحت مشمولات کا جس انداز سے علمی و ادبی تعارف کرایا گیا ہے، وہ بھی بجائے خود بہت جامع اور مانع ہے۔ ''ذکر رسول'' کے تحت قدیم دکنی شاعری اور رباعیوں میں شعرائے بہار کے حوالے سے جو مقدس اشعار آئے ہیں اور ان پر جو کچھ اظہار خیال ہوا ہے، وہ شمال و جنوب کے شعرا کی پرخلوص کاوشوں کے مظہر ہیں اور ان کے تعلق سے لکھنے والوں نے بھی بہت ہی قلمی اخلاص کا ثبوت دیا ہے۔ ''مقالات'' کے تحت جناب سلطان آزاد نے جانشین داغؔ، نسیمؔ ھلسوی عظیم آبادی پر لکھتے ہوئے داغؔ دہلوی کا پٹنہ سے ربط و تعلق اور سرزمین پٹنہ کے شعرا کی داغؔ سے خصوصی محبت کے ساتھ ان کی شاگردی کا جو ذکر کیا ہے، وہ کافی معلوماتی ہے اور نسیمؔ کی غزل گوئی پر جس طرح تجزیاتی نظر ڈالا ہے وہ بھی بہت خوب ہے۔ ''صحیح اردو کیسے بولیں؟'' کے تحت ڈاکٹر اسلم جاوداں نے اردو زبان و ادب کے قارئین اور شائقین کے لئے ایک اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ اس مختصر مگر، جامع مضمون سے استفادہ کیا جانا چاہئے، لیکن کچھ الفاظ سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً ''اساس'' میں پہلے حرف پر زیر بتایا گیا ہے جب کہ صحیح تلفظ اَساس یعنی پہلے حرف پر زبر کے ساتھ ہے۔ ''المنجد'' اور ''مصباح اللغات'' اور دیگر عربی لغات کے مطابق بھی یہی صحیح ہے۔ اسی طرح لفظ ''صحرا'' کے دوسرے حرف پر زبر بتایا گیا ہے، حالاں کہ اس پر جزم ہے۔ ''مملکت'' کا صحیح تلفظ بھی پہلے حرف پر زبر کے ساتھ ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ دیگر الفاظ بھی ہیں جن کے اعراب سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ''افسانے'' کے تحت فارسی افسانہ ''عدل'' کو نہایت ہی شستہ اور خوبصورت پیرائے میں ڈاکٹر مہتاب جہاں نے پیش کیا ہے، صادق چوبک کے اس افسانہ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار ابھی باحیات ہے اور حالاتِ حاضرہ کو افسانہ کا روپ دے رہا ہے۔ مجلّہ کے دیگر مشمولات بھی پسند آئے۔ اخیر میں آپ کا شکریہ اس لئے بھی ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ نے راقم الحروف کا مضمون ''پیارے نبی کا پیارا بچپن'' اس شمارے میں شامل کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ آپ کا دوبارہ شکریہ!

محمد میکائیل تابشؔ قاسمی، پٹنہ

☆ ستمبر ۲۰۲۴ء کا ''زبان و ادب'' پچھلے ہفتہ ملا۔ ٹائٹل رنگین اور حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی پاکیزہ بھی ہے۔ آپ نے بڑوں کے لئے ''ذکر رسول'' کا کالم بنا کر کچھ مضامین اس پرچہ میں شامل کیا ہے اور بات سمجھ میں آئی کہ ٹائٹل اسی لحاظ سے ہے۔ وہ مضامین تو ذرا گاڑھے قسم کے ہیں۔ ان میں شاعری بھی پرانے دور کی زبان میں ہے جو اجنبی اجنبی سی لگی۔ بڑے لوگ اُسے پڑھیں گے، یہاں اپنا تو اصل مطلب ''بچوں کا زبان و ادب'' سے ہے جو پچھلی بار کی طرح

اس بار بھی بہت پیارے ڈھنگ سے، سجا سجایا پڑھنے کو ملا ہے۔ اس کی شروعات جناب محسن رضا رضوی کی مناجاتی نظم ''......یارب'' اور جناب حیات بن عظمت کے نعتیہ مثلث ''ہمارے محمدؐ'' سے ہوئی ہے۔ مناجات کے یہ اشعار سچ مچ کتنے آسان اور پیارے ہیں ؎

ترے خلائق میں سے کسی کا
نہ دل ہو ہرگز ملول یا رب
چلوں اسی راہ پر ہمیشہ
دکھا گئے جو رسول یا رب

اسی طرح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے تعلق سے اپنے ٹیپ کے مصرع ''وہ آئے، وہ آئے، ہمارے محمدؐ'' کے ساتھ نعتیہ نظم بھی بہت خوب ہے، پھر جناب محمد میکائیل قاسمی کا مضمون ''پیارے نبی کا بچپن'' بھی پڑھا، اس میں بھی بہت سادہ زبان میں بہت ساری معلومات ایک ساتھ ملیں۔ رسول پاک کی دودھ شریک بہن شیما کا ذکر پڑھنے سے یاد آیا کہ بعد کو جب ایک لڑائی میں قیدی بن کر وہ آئی تھیں اور آپ کو بچپن میں دانت کاٹنے کا قصہ یاد دلا کر اس کا پروف کیا تھا تو آپ نے ان کے ساتھ کتنا اچھا برتاؤ کیا تھا۔ ''سائنس داں پروفیسر عبدالسلام'' پر ڈاکٹر محمد زاہد کا مضمون بھی اچھا اور معلوماتی ہے اور مجھے تو اس سے کہیں زیادہ اچھا اور نیا معلوماتی لگا وہ مضمون جو جناب نوازش خرم نے لکھا ہے۔ عنوان ہے ''بجلی کی چمک، بادل کی گرج''، یہ سائنسی مضمون اس تعلق کی تصویروں کے ساتھ چھپا ہے جس سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ جناب ابونصر فاروق صارم نے ''جان وطن ہے اردو، شان وطن ہے اردو'' کے عنوان سے بھی خوبصورت تحفہ دیا ہے اور اسی صفحہ پر رباعیوں کا فیــــلــر بھی پسند آیا۔ مبارک عظیم آبادی نے بڑی اچھی بات بتائی ہے کہ جس میں فارسی کا رنگ نہ ہو، وہ بہر حال اُردو ہے۔ اسی طرح بدیع الزماں قمر کی ناصحانہ رباعی بھی خوب ہے۔ سچ مچ مول تو اُسی عبادت کا ہے جو دل سے کی جائے اور اصل دولت تو وہی ہے جو آدمی اپنی محنت سے ایمانداری کے ساتھ کمائے، نہیں تو زبردستی کسی کے سر پر بوجھ بننا بیکار ہے۔ ثمر لاہوری کی رباعی پڑھ کر، میر کا مشہور شعر یاد آیا اور یہ نصیحت بھی تازہ ہوئی کہ آدمی اگر ہمت بنائے رکھے تو کسی بھی مشکل کا آسان ہونا ناممکن نہیں۔ ''اچھے چال چلن کی برکت'' پر جناب سید تنویر احمد کا اخلاقی مضمون بھی کافی عمدہ ہے۔

ایم ارفاق، بہار شریف

☆ ''زبان وادب'' ماہ اگست ۲۰۲۴ء نظر نواز ہوا۔ بلاشک وشبہ سرورق نہایت ہی دلکش وجاذب نظر ہے۔ پہلی ہی نظر میں زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' سابقہ روایت کے مطابق اس مرتبہ بھی آپ نے اداریہ میں شمارے کے مشمولات کا مختصر، مگر جامع تعارف اس نہج سے پیش کیا ہے کہ تخلیقات کا مطالعہ کرنے کی خواہش میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نشاط اختر کا مقالہ ''ذکر وطن اور اردو شاعری'' بے حد دلچسپ اور قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے اپنے مقالہ کے ذریعہ ''ڈاکٹر نوشہ اسرار کی شاعری کی بازگشت'' کا بھرپور احاطہ بڑی ہی خوش اسلوبی سے کیا ہے اور اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر رحمانی نے ''راشد انور راشد: یادیں اور باتیں'' سے متعلق کئی اہم پہلوؤں پر منصفانہ روشنی ڈالنے کی ہمہ جہت سعی کی ہے۔ امتیاز غدر نے اپنے افسانہ ''ماں کا شکم'' میں کوئلہ کھدانوں سے کوئلہ نکالنے کے مکمل عمل کا آنکھوں دیکھا منظر دلچسپ طریقے سے پیش کر دیا ہے۔ البتہ محمد طارق کے افسانہ ''بوجھ'' میں یہ بات ذہن قبول کرنے سے قاصر ہے کہ ایک باپ، اپنی بیٹی کو اُس بات کی چھوٹ دے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرے جو فطرتاً بھی معیوب ہے اور ہمارا معاشرہ تو یقیناً ترقی کے نام پر ایسی باتوں کی اجازت نہ کبھی دے سکتا تھا نہ آج دے سکتا ہے۔ معین کوثر کی تحریر کردہ مناجات، حافظ تمنا پھلواروی کی ''نعت پاک'' کے علاوہ وارث ریاضی، ظفر اقبال ظفر، خالد عبادی اور ڈاکٹر شمع ناسمین نازاں کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ ''کتابوں کی دنیا'' کے تحت تحریر کردہ سبھی تبصرے، بہتر ہیں۔ ساتھ ہی ''بچوں کا زبان وادب'' میں شائع جہانگیر انس کی تحریر ''قوس قزح کی کہانی'' بھی مجھے یقین بھی ہے کہ طلبہ کے لئے کارآمد ومفید ثابت ہوگی۔ والد مرحوم ومغفور جناب قمر زاہدی کے ماہ ولادت کی مناسبت سے اس شمارے کے دوسرے

اندرونی سرورق پر اہتمام کے ساتھ ان کی تصویر، دستی تحریر، ان کی کتابوں کے عکس، ان کی غزل اور مختصر سوانح حیات شائع کرنے کے لئے میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں، یقیناً آپ کے اس انتخاب پر جو''نام نیک رفتگاں ضائع مکن'' کے مزاج کا عکاس ہے، ان کی روح بھی ضرور خوش ہوگی۔

(ڈاکٹر) قیصر زاہدی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' اگست ۲۰۲۴ء کا شمارہ موصول ہوا۔ پڑھ کر دل و دماغ باغ وبہار ہوگئے''حرفِ آغاز'' پھر''ذکر وطن اور اردو شاعری''(ڈاکٹر نشاط اختر)''جمیل مظہری کی دو وطنی نظمیں: ایک تجزیہ''(نجم الزماں)''اے زمین وطن''(شجاع الدین شاہد)''سرزمین ہند''(حامد حسین ندوی)''عظمت ہندوستاں''(مصطفیٰ غزالی) کی نظمیں پھر پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم، ڈاکٹر سید احمد قادری، ڈاکٹر سید نقی عباس کیفی، ساحر داؤدنگری، ڈاکٹر ابرار رحمانی، احمد صغیر اور ڈاکٹر صابر علی سیوانی کی تحریریں''عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری''،''ڈاکٹر نوشہ اسرار کی شاعری کی بازگشت''،''ذبیح اللہ صفا کی بیدل شناسی''،''مولانا الطاف حسین حالی: قومی یکجہتی کے باوا''،''راشد انور راشد: یادیں اور باتیں''،''بدنام نظر: یادوں کے آئینے میں''،''ظفر رانی پوری: کچھ یادیں کچھ باتیں'' بہت اچھی لگیں۔ اس شمارے کے افسانے''بوجھ''،''رنگ''،''ماں کا شکم'' اور''طنز ومزاح'' کے تحت''لیٹ'' کے عنوان سے شامل تحریر بھی خوب ہے۔ ایک طرف جہاں''نعت پاک''،''مناجات''، اور''غزلیں'' دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئیں، وہیں دوسری طرف''بچوں کا زبان وادب'' میں محمد رضوان احمد کے قلم سے''دو حکمراں دو کہانی'' بے حد پسند آئی۔

محمد بلال الدین، بھاگلپور

☆ اگست ۲۰۲۴ء کا''زبان وادب'' موصول ہوا، یوں تو اس شمارے کی سبھی نگارشات قابل تحسین ہیں، لیکن''ذکر وطن'' کے تحت ڈاکٹر نشاط اختر کا خصوصی مقالہ اور پھر''مقالات'' کے ذیل میں پروفیسر توقیر عالم کا مقالہ''عصمت چغتائی کی خاکہ نگاری'' اور ساحر داؤدنگری کا مقالہ''مولانا الطاف حسین حالی: قومی یکجہتی کے باوا'' بے حد پسند آیا۔ شجاع الدین شاہد، حامد حسین ندوی اور محمد مصطفیٰ غزالی کی وطنی شاعری بھی بے حد پسند آئی۔ محمد طارق کا افسانہ''بوجھ'' اور امتیاز غدر کا افسانہ''ماں کا شکم'' بھی کافی اچھا لگا۔ معین کوثر کی مناجات دل کو بھا گئی اور''بچوں کا زبان وادب'' میں صبا نقوی کے کلام''معصوم دل کی دعا'' کا کیا کہنا۔ سبھی لکھنے والوں کو دلی مبارکباد!

محمد منظر عالم، دربھنگہ

☆ ''زبان وادب'' کا شمارہ جولائی ۲۰۲۴ء موصول ہوا، شکریہ! غزل کی اشاعت کے لئے بھی شکر گزار ہوں، البتہ میری پہلی غزل کے دوسرے شعر کے مصرع اولی میں''سے'' کی جگہ''ہے'' چھپ گیا ہے، جس سے شعر کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ اصل مصرع یوں ہے ع

فضل ربی سے عصا کا یہ کرشمہ دیکھئے

متذکرہ شمارے کے مشمولات بھی ہمیشہ کی طرح خوب سے خوب تر ہیں۔

مدثر عمر کیفی، بھوجپور

☆ اکادمی مجلّہ''زبان وادب'' کے حالیہ شمارے مطالعہ میں ہیں۔ چند ماہ پہلے مئی ۲۰۲۴ء کے''زبان وادب'' میں میرا افسانہ''لیکھک'' شائع ہوا تھا، مگر بعض وجوہ سے میں بروقت خط نہیں لکھ سکا، بہرحال آپ کی اس ذرہ نوازی کا بے حد شکریہ! مجھے خوشی ہے کہ میری اس کہانی کو قارئین نے پسند کیا،''سلام وپیام'' میں میرے افسانوں کا ذکر رہا، فون بھی آئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے''حرفِ آغاز'' میں میری حوصلہ افزائی کی۔ ایک بار پھر شکریہ!

شاہد فروغی، ہوڑہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا
زبان وادب

☆	گاندھی جی کا بچپن	عظیم اقبال	۷۴
☆	چندا تارے جیسے بچے / رائی پیاری	انور آفاقی	۷۶
☆	ساحرؔ کے نغموں میں بچے	شرف الہدیٰ	۷۷
☆	وقت کی اہمیت	حیدر امام حیدر	۷۸
	لال بہادر شاستری	علی عامر	۸۰

عظیم اقبال

Adabistan Ganj-1, Bettiah-845439 (Mob.9006502649)

گاندھی جی کا بچپن

پور بندر ہندوستان میں کاٹھیواڑ کے ساحل پر ایک قدیم بندرگاہ ہے۔اسی جگہ ۲/اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ایک ایسے شخص کی پیدائش ہوئی، جو مزاجاً درویش صفت تھا۔وہ شخص موہن داس گاندھی کے سوا کوئی اور نہ تھا، جنہیں ہم مہاتما گاندھی کہتے ہیں۔

ان کے والدین تھے، کرم چند گاندھی اور پتلی بائی۔موہن داس کوتاہ قد اور سیاہ فام تھے۔وہ دوسرے بچوں سے مختلف نہیں لگتے تھے، تاہم وہ کوئی معمولی شخص نہیں تھے۔تاریخ میں وہ اولین جنگجو ہوئے، جنہوں نے کسی ہتھیار کے بغیر جنگ لڑی۔پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ایک نہتے انسان نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکر لی ہو اور کامیابی پائی ہو۔انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف محاذ آرائی کی اور ہندوستان کو آزادی دلائی۔

سچ تو یہ ہے کہ گاندھی جی نے ایک خوف زدہ قوم کے دل سے خوف نکال دیا، ایک روندی ہوئی قوم میں نئی روح پھونک دی۔موہن داس، کرم چند گاندھی کے چھ بچوں میں سب سے چھوٹے تھے۔گھر میں وہ سب کے دلارے تھے، سب انہیں ''مونیا'' کہہ کر پکارتے تھے۔مونیا کو اپنی والدہ سے بہت پیار تھا۔وہ ایک مذہبی سوچ والی خاتون تھیں۔

مونیا کو اپنے والد سے بھی بہت لگاؤ تھا، پھر بھی وہ ان سے ڈرتے تھے۔مونیا کو کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔گھر پر وہ کم ہی ٹھہرتے تھے۔ وہاں کھانے کے لیے جاتے، پھر کھیل کے لیے نکل جاتے۔کبھی بھائی بہن انہیں چھیڑتے تو دوڑ کر بھاگ جاتے اور پھر اپنی والدہ سے ان سب کی شکایت کرتے:

''جو کوئی پریشان کرتا ہے، اسے پیٹتے کیوں نہیں؟''

والدہ ہنس کر پوچھتیں:

''اماں!'' مونیا کا منھ کھلتا'' اپنے بھائی کو میں کیسے مار سکتا ہوں!'' آگے کہتے'' کسی کو کیوں ماروں بھلا۔''

ان کی یہ بات سن کر والدہ انہیں پیار سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتیں اور چمکارتیں۔انہیں بڑی حیرت ہوتی کہ ایسے خیالات ایسے چھوٹے بچے کے دل میں کیسے آتے ہیں۔

جب مونیا کی عمر سات برس تھی، ان کے والد راج کوٹ کے دیوان مقرر ہوئے۔اس کے بعد پورے گھر نے پور بندر کو خیر باد کہا اور راج کوٹ میں رہائش اختیار کر لی۔

یہاں، مونیا کا داخلہ ایک پرائمری اسکول میں ہوا۔ وہ فطرتاً بہت ہی شرمیلے تھے اور اسی لئے دوسرے بچوں کے ساتھ جلدی گھلتے ملتے نہیں تھے۔

ہر صبح وقت پر وہ اسکول جاتے۔اسکول کی چھٹی ہوتی تو وہ بھاگ کر گھر پہنچتے۔صرف ان کی کتابیں ان کی دوست تھیں۔اپنا سارا وقت کتابیں پڑھنے میں گزار دیتے۔

مونیا کا ایک دوست تھا، یوکا۔وہ صفائی کا کام کرتا تھا۔ایک دن والدہ نے مونیا کو کھانے کے لیے مٹھائی دی۔ وہ دوڑتے ہوئے باہر نکلے تا کہ اپنے دوست کے ساتھ مل کر مٹھائی کھائیں۔ والدہ نے کھڑکی سے انہیں دیکھ لیا۔وہ بہت جھلائیں، انہیں واپس بلایا۔

''کیا تمہیں پتہ نہیں کہ وہ ایک اچھوت ہے؟''

''اماں'' پورے احترام سے مونیا نے منھ کھولا:'' میں نہیں سمجھتا کہ یوکا اچھوت ہے۔کسی طرح سے بھی وہ مجھ سے مختلف نہیں۔''

ایک دفعہ مونیا نے شرون کمار کی کہانی پڑھی۔ شرون، ایک نیک اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے والدین ضعیف اور معذور تھے۔ شرون انہیں جگہ جگہ لے جاتا۔ مونیا اس واقعے سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ ''میں بھی شرون بنوں گا'' مونیا کے دل میں خیال آیا۔

ان ہی دنوں مونیا نے ایک ناٹک دیکھا۔ وہ راجہ ہریش چندر کے متعلق تھا۔ سچ کے لیے اپنی وابستگی کے سبب وہ معروف تھے۔

''ہم سب کو ہریش چندر کی طرح ہونا چاہئے۔''

مونیا کے دل کی بات بارہا ان کے منھ سے نکل جاتی۔

آیئے ان کے بچپن کا ایک واقعہ سنائیں۔ ایک دفعہ اسکول میں جانچ کے لیے انسپکٹر آئے۔ ان کے درجے میں انگریزی کے چند الفاظ بول کر لکھوائے گئے۔

تقریباً سارے لڑکوں نے الفاظ درست لکھے۔ صرف مونیا نے ایک لفظ غلط لکھا۔ استاد نے دیکھا اور بغل کے لڑکے کی کاپی سے نقل کرنے کا اشارہ کیا۔

مونیا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ استاد انہیں نقل کی ہدایت کیوں دے رہے ہیں۔ آخر جہاں دوسرے لڑکوں کو شاباشی ملی، وہیں مونیا پر کند ذہن ہونے کا الزام لگا۔

مونیا کی عمر جب صرف تیرہ سال تھی، ان کے والدین نے ان کے لئے دلہن چن لیا۔ وہ پور بندر میں رہتی تھی اور اس کا نام کستور با تھا، وہ بہت حسین تھی۔

چلئے! اب مونیا کو موہن داس کے بطور یاد کریں۔

موہن داس اور کستور با مل کر کھیلتے، بھاگتے، دوڑتے۔ موہن داس کستور با کو پڑھانے کی کوشش کرتے، لیکن ان کا دل گھریلو کام کاج میں زیادہ لگتا تھا۔

ایک دن موہن داس کی ملاقات اپنے بڑے بھائی کے ایک دوست سے ہوئی۔ وہ لمبے، تڑنگے تھے۔ بتایا گیا کہ ان کے جیسے گوشت خور ہو جائیں تو موہن داس کا ڈیل ڈول بھی ایسا ہی نکل آئے گا۔ یوں، موہن داس نے گوشت خوری شروع کر دی۔ ایسا گھر سے باہر کھانے پر ہوتا اور گھر میں بہانہ بنا دیا جاتا، مگر جھوٹ سے موہن داس کو دلی تکلیف ہوتی۔ آخرش، گوشت سے ان کا دل بھر گیا۔

اُس دوست نے موہن داس کو سگریٹ پینے پر بھی آمادہ کیا۔ گھر سے چھوٹی موٹی چوری بھی ہونے لگی۔ چوری کے پیسے سے سگریٹ کی خریداری ہوتی۔ ادھار کی نوبت بھی آئی۔ ادھار چکانے کے لیے گھر سے سونے کا ایک زیور بھی چرایا گیا۔ اس سے ضمیر نے ملامت کی، پھر آئندہ کے لئے توبہ کی گئی۔

موہن داس نے اپنے گناہ کا اعتراف تحریری طور پر کیا۔ تحریر والد کو ملی۔ ان دنوں وہ صاحب فراش تھے۔ والد نے تحریر پڑھی اور کاغذ کے ٹکڑے کر دیے۔ انہوں نے موہن داس سے کچھ نہ کہا۔

کاغذ کے ٹکڑے فرش پر بکھر گئے، انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور کروٹ بدل لی۔ موہن داس کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

اس دن کے بعد موہن داس نے اپنے والد کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا اور اپنا بیشتر وقت ان کے بستر کے پاس اور ان کی سیوا میں گزارنے لگے، مگر موہن داس کے والد کی طبیعت سنبھلی نہیں۔ وہ دن بہ دن بگڑتی چلی گئی، پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت موہن داس کی عمر محض سولہ سال تھی۔

عزیز بچو! مشاہیر کی زندگی کے واقعات سے ہمیں تحریک ملتی ہے اور انہیں دھیان میں رکھیں تو زندگی گزارنے کا ہنر بھی آتا ہے اور ان کے بارے میں جانیں تو ان کے تئیں ہمارا احترام بڑھتا ہے۔ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے خود کو آمادہ کرتے ہیں، ان کی کوتاہیوں سے ہم سیکھتے ہیں اور ان سے اجتناب کرتے ہیں۔ موہن داس کرم چند گاندھی نے ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے۔ ہم دیش کی خاطر ان کے کارناموں کے بے حد ممنون ہیں۔

باپو: ڈاک ٹکٹ میں

انور آفاقی

"Hoda Manzil" Rajtoli, Bhigo, P.o. Lalbagh, Dist. Darbhanga - 846004
(Mob. 9931016273)

چندا تارے جیسے بچے

چندا تارے جیسے بچے
دل کے بھولے بھالے بچے
جاتے ہیں اسکول سویرے
بستہ پیٹھ پہ لادے بچے
اچھے انساں بنتے ہیں ، جب
خوب پڑھائی کرتے بچے
جو بھی اَمی بنا کر دیتیں
لنچ وہی کھاتے ہیں بچے
علامہ اقبالؔ کے نغمے
خوش ہو کر ہیں گاتے بچے
باپو اور آزاد کا دل سے
گن گاتے ہیں اچھے بچے
کل کے دیش کے رکھوالے ہیں
آج کے یہ سب بھولے بچے
انورؔ جی کی نظمیں پڑھ کر
دل سے ہیں خوش ہوتے بچے

❁❁❁

اَمی پیاری

امی صبح کو جگتی ہیں
اور ہم سب کو جگاتی ہیں
صبح کو جلدی جلدی وہ
ناشتہ سب کا بناتی ہیں
بھیج کے ہم سب کو اسکول
پھر وہ گھر کو سجاتی ہیں
باورچی خانہ میں جا کر
کھانا دن کا پکاتی ہیں
کپڑے گندے ہم سب کے
تنہا خود ہی دھوتی ہیں
جب اسکول سے ہم آتے
کھانا ہمیں کھلاتی ہیں
شام کو پھر پیاری امی
سبق یاد کرواتی ہیں
رات کا کھانا ہمیں کھلا کر
چند قدم چلواتی ہیں
امی ہی کے پاؤں تلے
جنتیں ساری ہوتی ہیں

❁❁❁

شرف الہدیٰ

C/o Prof. Md. Umair Khan, Mewa Saw Lane, Sultanganj,
Patna 800006 (Mob. 8227937574)

ساحر کے نغموں میں بچے

ساحر لدھیانوی کا اصلی نام عبدالحئی تھا،مگر وہ فلمی اور ادبی دنیا میں ساحر لدھیانوی کے نام سے مقبول ہوئے۔ساحر لدھیانوی کی پیدائش ۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ میں ہوئی تھی اور تعلیم S.C.D. Govt. College لدھیانہ میں ہوئی۔

ساحر نے اردو کے علاوہ ہندی زبان میں بھی گیت اور نغمے لکھے۔ساحر ایک انقلابی رائٹر اور شاعر کے طور پر ابھرے۔فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اپنی زبردست پہچان بنائی۔ساحر مقبول جریدے ”ادب لطیف“، ”شاہکار“ اور ”سویرا“ وغیرہ کے ایڈیٹر بھی رہے اور بڑی خوبی سے ادبی صحافتی خدمات انجام دیں۔مشہور Lyric Writer ساحر لدھیانوی Progressive Writers Association کے ممبر بھی رہے۔ان کی پہلی کتاب ”تلخیاں“ ۱۹۴۵ء میں منظر عام پر آئی۔شروع میں انہوں نے فلم ”آزادی کی راہ“ پر کے لئے چار گیت لکھے ۱۹۵۱ء سے فلم ”بازی“ میں انہیں خاص شہرت ملی۔۱۹۷۱ میں ساحر کو پدم شری ایوارڈ اور پھر ۱۹۷۴ اور ۱۹۷۷ میں فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۱۹۵۷ تک ساحر اور ایس۔ڈی برمن نے ایک ساتھ کام کیا، بعد میں اُن کے درمیان کسی بنا پر اختلاف ہوا اور یہ دونوں الگ ہوگئے۔ساحر فلم وادب کی جانی مانی شخصیت تھی۔انہوں نے اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فلمی گیتوں کو بھی ایک نیا آہنگ دیا۔وہ جس طرح کا ہندوستان چاہتے تھے، اس کا عکس ان کے فلمی گیتوں میں صاف صاف نظر آتا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس وقت ہمارا موضوع ”ساحر کے نغموں میں بچے“ ہیں۔

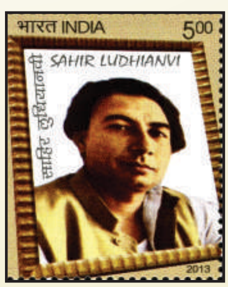

ساحر تھے تو غیر شادی شدہ،مگر دنیا کے سارے بچے ان کے بچے تھے، جیسا کہ ان کے گیتوں سے پتہ چلتا ہے، انہوں نے صرف بڑوں کے لئے شاعری نہیں کی، بلکہ بچوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور بہترین فلمی گیت لکھے۔ اپنے فلمی گانے اور گیت میں وہ سیدھے بچوں سے باتیں کرتے ہیں۔ان کا لکھا ایک گیت جو فلم ”دو کلیاں“ میں بچوں کو لے کر تھا، اپنے وقت میں کافی مقبول ہوا تھا۔ ان کے الفاظ آسان اور عام فہم ہوتے تھے۔

بچو! ساحر صاحب کے چند گیت یہاں پیش کر رہا ہوں جن میں بچے زیادہ مخاطب ہیں۔ جیسے ؎

بچو! تم تقدیر پر ہو کل کے ہندوستان کی
باپو کے وردان کی، نہرو کے ارمان کی
آج کے ٹوٹے کھنڈروں پر کل دیش بساؤ گے
تم ننھی بنیادیں ہو دنیا کے نئے ودھان کی
بچو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

پھر یہ گیت بھی دیکھئے ؎

بچے من کے سچے سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے

اسی طرح ؎

خود روٹھیں خود من جائیں ، پھر ہمجولی بن جائیں
جھگڑا جس کے ساتھ کریں، اگلے ہی پل پھر بات کریں
ان کو کسی سے بیر نہیں، ان کے لیے کوئی غیر نہیں
ان کا بھولا پن ملتا ہے سب کو بانھ پسا رے

(بقیہ ص ۷۹ پر)

حیدر امام حیدر

"Kazmi Begum Colony" Sale Taxes Office, Patna City - 800008 (Mob. 9334787273)

وقت کی اہمیت

وقت —— تین حرفوں سے بنا ایک چھوٹا سا لفظ، لیکن عزیز بچو! اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا، ہم آپ میں سے کسی کے لئے بھی مشکل نہیں۔ بیشک وقت خدائے پاک کی عظیم الشان نعمت ہے اور اس کا زندگی اور بندگی سے یا یوں کہیں کہ انسان اور کائنات بلکہ دنیا اور آخرت سے بھی اٹوٹ رشتہ ہے۔ اللہ نے انسان کو اس دنیا میں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے تو اس دنیا اور کائنات کے سارے نظام کو قدرتی طور پر وقت سے منسلک کر دیا ہے، یہاں تک کہ اس کے بعد آنے والی دنیا یعنی آخرت کے معاملوں اور وہاں کے حساب وکتاب میں بھی وقت کی بات سے چھٹکارا نہیں۔ بیشک حشر کا دن اور فیصلے کا وقت مقرر ہے۔

بیشک یہ وقت ہی ہے جس سے ہمیں پیدائش کی تاریخ ملتی ہے اور ہماری زندگی کے تینوں پن کی پہچان ہوتی ہے۔ بچپن سے گزر کر ہم جوانی کے دور میں آتے ہیں، پھر ہمارا بڑھاپا آتا ہے اور وہ گھڑی آجاتی ہے جب زندگی تمام ہوتی ہے اور آدمی موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح عبادت اور بندگی کے معاملوں سے بھی وقت کا اٹوٹ رشتہ ہے، نماز روزے کی بات ہو یا کسی دوسرے مذہب میں پوجا پاٹ کی باتیں، اگر وہ وقت سے بے وقت ہوں تو ان کا کوئی مول نہیں۔ وقت کو ہم صبح، دوپہر، شام کے حوالے سے یاد کریں یا دن رات، سکنڈ، منٹ، گھنٹے، ہفتہ، مہینہ اور سال کے حوالے سے اس کا ذکر کریں، بہر حال اس کی اہمیت اور اس کی تاثیر سے انکار کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔

وقت کا بنیادی وصف تسلسل ہے، وقت گزر جاتا ہے، گزرتا رہتا ہے اور آتا رہتا ہے۔ اسی کا نام ماضی، حال اور مستقبل ہے۔ وقت نہ تو کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ہی گیا وقت پھر لوٹ کر آتا ہے۔ اس دنیا اور کائنات کا پورا نظام وقت کے دھاگے میں بندھا ہوا اور پرویا ہوا ہے اور یقیناً بہت ہی عقلمند ہیں وہ لوگ جو وقت کی اہمیت سمجھتے ہیں اور اس کی ناقدری سے بچتے ہیں۔

وقت برباد کرنا گویا اپنے ہاتھوں اپنے کو یقینی ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ وقت کا ہر لمحہ سونے کے ذرّے کی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ وقت برباد کرنے والوں کو کبھی فلاح اور کامیابی نہیں ملتی ہے، وجہ یہ ہے کہ وقت اللہ کا تحفہ ہے اور اس کی ناقدری گویا اللہ کے تحفہ کو جان بوجھ کر ٹھکرانا ہے اور خود کو ناشکری کے عذاب میں ڈالنا ہے۔

عام طور پر، ہم اور آپ دو چار منٹ بلکہ دس بیس منٹ کی بربادی پر ذرا بھی دھیان نہیں دیتے، لیکن سچ یہ ہے کہ زندگی میں فتح و نصرت کا راز، ایک ایک لمحہ کی حفاظت میں چھپا رہتا ہے، نپولین نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ دشمنوں پر میں اس لئے فتح پاتا ہوں کہ وہ عام طور سے چند لمحوں کو کچھ نہیں سمجھتے اور میں ان کی قدر و قیمت خوب خوب سمجھتا ہوں۔ ایک لمحہ کی غفلت بسا اوقات ہمیں کامیابی کی منزل سے سینکڑوں سال دور کر دیتی ہے یا پھر پل بھر کی ہوشیاری بڑی آفت اور مصیبت سے بچا لیتی ہے، ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وقت کو اپنی پکڑ میں لینے کا ہمیں موقع مل جاتا ہے۔ جب آدمی وقت کی قدر کرنا جان لیتا ہے، اس کے صحیح مصرف کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے تو قدرت اس کی مدد کرتی ہے اور اُس کے وقت میں برکت مل جاتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ بظاہر کاموں کی زیادتی، ذمہ داریوں کے بوجھ اور کڑی محنت سے وقت میں کمی نہیں آتی، بلکہ وقت کی کمی، وقت کے غلط اور احمقانہ استعمال سے وقت کی برکت جاتی رہتی ہے پیدا ہوتی ہے۔ وقت اور حوصلہ کا بڑا عجیب رشتہ ہے ؎

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہے جیسے ربڑ
کھینچنے سے بڑھتا ہے، چھوڑے سے جاتا ہے سکڑ

زندگی میں آرام کا وقت بھی آتا ہے اور تکلیف کا وقت بھی اور دونوں اصل میں امتحان کا وقت ہوتا ہے کہ دولت اور آرام پا کر آدمی کاہل اور مغرور نہ ہو اور مشکل کی گھڑی میں ہمت نہ ہارے اور امید نہ چھوڑے، بلکہ ہر حال میں صبر و شکر کا دامن تھام رکھے اور وقت کے بدلاؤ سے تجربہ حاصل کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی سوچ اور اس کے عمل کا دارومدار اور اعتبار وقت کو سمجھنے ہی سے وابستہ ہے، بلکہ قدرتی معاملوں کی اہمیت بھی وقت ہی سے جڑی ہوتی ہے۔ ''بے وقت کی شہنائی'' اور ''بعد محرم یا حسین'' کی کہاوتیں انہیں لوگوں کے لئے ہیں جو وقت کی اہمیت سے غافل ہوتے ہیں۔ جب پڑھنے، سیکھنے اور آگے بڑھنے کا زمانہ ہوتا ہے، اُس وقت بھلی باتوں پر دھیان نہیں دیتے اور پھر زندگی بھر اُس بھول پر پچھتایا کرتے ہیں جس کا نام وقت کی پامالی اور ناقدری ہے، حالانکہ اس پچھتاوے سے انہیں کبھی کوئی فائدہ نہیں ملتا۔ شاعر نے وقت کی اہمیت کے تعلق سے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ ؎

کیوں نہ ہم وقت کی رفتار سے چلنا سیکھیں
جو میرے کل کے زمانے کی ضمانت ہوگی

وقت کی رفتار سے چلنے کا مطلب یقیناً وقت کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی اور زمانے کا مستقبل انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے جو وقت کی صحیح پہچان رکھتے ہیں اور دوسری دنیا کی کامیابی اور عبادت و بندگی کا ثمرہ بھی انہیں کے لئے ہے جو وقت پر اپنے پالنہار کے احکامات بجالاتے ہیں۔ ❁❁

ساحؔر کے نغموں میں بچے (ص ۷۷ سے آگے)

یوں تو شکیلؔ بدایونی، مجروحؔ، گلزار اور شیلندر نے بھی بچوں کے لئے بہترین اور پسندیدہ فلمی نغمے لکھے ہیں، لیکن ساحؔر لدھیانوی نے سب سے زیادہ لکھا ہے اور سب کے من کو لبھانے والا بھی۔

ساحؔر نے جن ہٹ فلموں کے لیے گیت لکھے ان میں قابل ذکر ہیں ''کبھی کبھی''، ''آ گلے لگ جا''، ''لیلیٰ مجنوں''، ''نیا دور''، ''سادھنا''، ''نیل کمل''، ''ترشل''، ''دی برننگ ٹرین'' اور ''وقت'' وغیرہ۔

انہوں نے محمد رفیع، لتا، کشور کمار اور آشا جیسے گلوکاروں کے لیے بھی نغمے تحریر کئے اور اس طرح شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ ان کے اعزاز میں ۲۰۱۳ء میں ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا گیا تھا۔ ان کا انتقال ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ممبئی میں ہوا۔ ❁❁

تم گوروں سے یہ کاگا بھلا

عزیز بچو! سفید رنگ کے لئے ایک کہاوت ہے: ''بگلے کے پر کی طرح''، اصل یہ ہے کہ جس طرح ہنس کا رنگ سفید ہوتا ہے اسی طرح بگلا بھی بالکل ہی سفید ہوتا ہے۔ بگلے کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند کئے تالاب کے کنارے اس طرح بیٹھا رہتا ہے جیسے کوئی مہارشی تپسیا کر رہا ہو، دھیان گیان میں لگا ہو، لیکن جیسے ہی کوئی مچھلی پانی کے اوپر آتی ہے، وہ جھٹ سے اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور مچھلی کو چونچ میں پکڑ کر کھا لیتا ہے اور پھر اسی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ ایک بار کی بات ہے کہ گنگا ندی کے کنارے ایک مہارشی پنڈت دھیان گیان میں لگے ہوئے تھے کہ ایک بگلا آیا اور قریب ہی بیٹھ گیا، پھر ایک کوا آیا اور وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ مہارشی پنڈت جی نے دیکھا اور کوے سے بولے: ''مہاراج اِدھر آؤ، میرے قریب بیٹھ جاؤ''۔ بگلے کو جسے اپنی خوبصورتی اور گوری گوری رنگت پر بڑا ناز تھا، پنڈت جی کی یہ بات بہت بری لگی، کہنے لگا: ''مہاراج! یہ آپ کا بڑا انیائے ہے، میں پہلے آیا ہوں اور پھر میں گورا بھی ہوں، مگر آپ مجھے اپنے پاس نہ بلا کر اس کوے کو اپنے قریب بلا رہے ہیں جو میرے بعد آیا ہے اور پھر اس کا رنگ بھی کالا کلوٹا ہے۔'' بگلے کی یہ بات سن کر پنڈت جی کو ہنسی آ گئی، کہنے لگے: ''اے بگلا بھگت! سنو بات یہ ہے کہ تمہارا تن گورا سہی، مگر من بالکل کالا ہے اور تمہارے کرتوت بھی تو بالکل سیاہ ہیں۔ اوپر سے تم گورے ہوئے تو کیا ہوا۔ میں مانتا ہوں، کوا بھی بالکل کالا ہے اور اس کے کرتوت بھی بالکل سیاہ ہیں، مگر وہ اوپر سے بھی تو کالا ہی ہے۔ اس کا ظاہر اور اس کا باطن دونوں یکساں ہے۔ یاد رکھو! تم گوروں سے یہ کاگا بھلے جو باہر بھیتر ایک۔ (ماخوذ)

علی عامر
Sultanganj, Patna - 800006

لال بہادر شاستری

پیارے بچو! آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ ۲؍اکتوبر کو گاندھی جی کی پیدائش کے علاوہ، ہندوستان کے ایک مشہور سیاست داں، مدبر، رہنما اور استاد کی بھی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ مشہور ہستی شری لال بہادر شاستری کی ہے، جن کی پیدائش ۲؍اکتوبر ۱۹۰۴ء کو مغلپور (اتر پردیش) میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام شاردا پرساد شری واستو تھا۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھے۔ جب شاستری جی صرف ڈیڑھ سال کے تھے تو ان کا انتقال ہوگیا۔ شاستری جی کو ان کی والدہ رام دلاری دیوی نے بڑی مشکل حالتوں میں پالا پوسا اور بڑا کیا۔

شاستری جی نے شروعاتی تعلیم وارانسی (بنارس) میں حاصل کی۔ بعد میں کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور انہیں اس کے ساتھ ''شاستری'' کی ڈگری (لقب) سے بھی نوازا گیا۔ اس کے بعد ہی سے لال بہادر جی نے اپنے نام کے آگے شاستری لگانا شروع کیا۔ انہیں ''ننھے'' کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا جسمانی قد عام لوگوں سے کم تھا، مگر یہ بات کون جانتا تھا کہ یہی ناٹے قد کا نوجوان، آگے چل کر اپنے عظیم کارناموں کی بدولت تاریخ میں کوتاہ قد شہزادہ کہلائے گا۔

شاستری جی اپنے استاد مشرا جی کی تحریک سے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئے۔ گاندھی جی کی حوصلہ افزائی سے اُس زمانے کی کئی تحریکوں میں حصہ لیا اور انہیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔

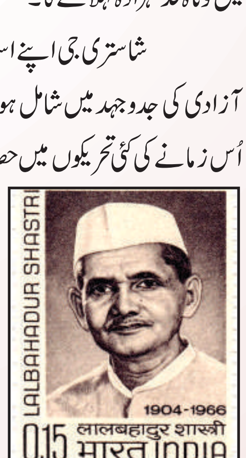

لال بہادر شاستری جی نے گاندھی جی کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ''لوک سیوک منڈل'' کے رکن کی حیثیت سے بھی کافی جدوجہد کی۔ شاستری جی کی سیاسی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کے بعد انہیں اتر پردیش میں اپنے آبائی علاقے میں پارلیمانی سکریٹری منتخب کیا گیا۔ بعد ازاں انہیں پولیس اور ٹرانسپورٹ کا وزیر بھی مقرر کیا گیا۔ انہوں نے فرقہ دارانہ فساد کو روکنے اور ختم کرنے میں بھی کافی اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہ نہرو جی کے بلاوے پر مرکزی حکومت میں شامل ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں عام انتخابات میں کانگریس پارٹی کی شاندار فتوحات کے بعد شاستری جی کو ریلوے اور ٹرانسپورٹ کا وزیر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں وہ تجارت اور صنعت کے وزیر اور ۱۹۶۱ء میں امور داخلہ کے وزیر بنے۔ ۹؍جون ۱۹۶۴ء کو شاستری جی ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم بنے۔ ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند (روس) میں ان کی وفات ہوئی۔

شاستری جی ایک مدبر، سیاست دان، استاد اور سیاسی رہنما تھے۔ ''جے جوان، جے کسان'' ان کا ہی دیا ہوا مشہور نعرہ ہے۔ لال بہادر شاستری کا ایک مشہور قول ہے:

"Hard work is equal to prayer"

یعنی مشکل کام عبادت کے برابر ہے۔ شاستری جی صرف باتوں کے دھنی نہیں تھے بلکہ واقعی وہ وقت پر کڑی سے کڑی محنت بھی عبادت جیسے جذبے سے کیا کرتے تھے۔

بچو! اس طرح سے شاستر جی کی زندگی، ان کا سیاسی کردار اور ملک میں امن و امان اور زراعتی و اقتصادی ترقی کے لئے ان کے عزائم، ایک مثال بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ شاستری جی کو ان کی عظیم الشان خدمات کے لئے بھارت رتن (۱۹۶۶ء) سے بھی نوازا گیا۔ ان کے سمارک کا نام ''وجئے گھاٹ'' ہے۔ حکومت ہند نے ان کی یاد میں کئی ڈاک ٹکٹ بھی جاری کئے ہیں۔

غزل

ہوا ہے غم سے یہ عالم ہمارا
کہ کرتا ہے عدو ماتم ہمارا

نہ کیوں کر غم سے ہو ہم کو مسرت
مسرت آپ کی ہے غم ہمارا

دل و دیدہ سے ہوتی راز داری
کوئی ان میں بھی تھا محرم ہمارا

قصور اس عاشقی میں حضرت دل
زیادہ آپ کا ہے ، کم ہمارا

کوئی بھرتا نہیں اب عشق کا دم
غضب کا اے آثر تھا دم ہمارا

امداد امام آثر

سید امداد امام آثر ابن شمس العلما سید وحید الدین خان بہادر کی تاریخ ولادت ۱۷؍اگست ۱۸۴۹ء اور جائے ولادت ضلع پٹنہ موضع سالار پور ہے۔ انہوں نے اپنے والد محترم اور پھر محمد محسن بنارسی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آثر نے اسکول کی تعلیم کے بعد پٹنہ کالجیٹ سے انٹرنس کے امتحان میں بھی کامیابی پائی تھی اور بنارس کے کسی کالج سے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور کچھ دنوں وکالت کے پیشہ سے بھی وابستہ رہے تھے۔ آثر کو ۱۸۸۹ء میں حکومت کی طرف سے ''شمس العلما'' کا اور ۱۹۰۹ء میں ''نواب'' کا خطاب ملا۔ آثر کی پہچان شاعر کی حیثیت سے بھی ہے اور نثر نگار کی حیثیت سے بھی۔ ان کا دیوان پہلی بار آرہ سے ۱۸۹۷ء میں اور دوسری بار والی ریاست رام پور کے زیر نگرانی ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا۔ ان کے کلام کا ایک عمدہ انتخاب ان کی کتاب ''فسانہ ہمت'' میں بھی شامل اشاعت ہے۔ نثر میں امداد امام آثر کی متعدد کتابیں اشاعت یافتہ ہیں اور متنوع موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ''مرأۃ الحکما'' فلسفیوں کے آثار و افکار پر ہے تو ''کتاب الاثمار'' میں اشجار و اثمار کے فوائد سے بحث کی گئی ہے اور ''کیمیائے زراعت'' میں کاشتکاروں کے مسائل زیر تحریر آئے ہیں۔ آثر کی بعض کتابیں ردّ عیسائیت میں اور عقیدۂ امامیہ سے متعلق بھی ہیں، لیکن آثر کی اصل شہرت جس کتاب کی بدولت ہوئی، وہ ''کاشف الحقائق'' ہے شاعری کے اصول پر آثر کی اس کتاب میں یونانی، انگریزی، فارسی اور عربی کے شعرا کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ آثر کی وفات آبگلہ، گیا میں ۱۷؍اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ہوئی۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 **October - 2024** **No. 10**

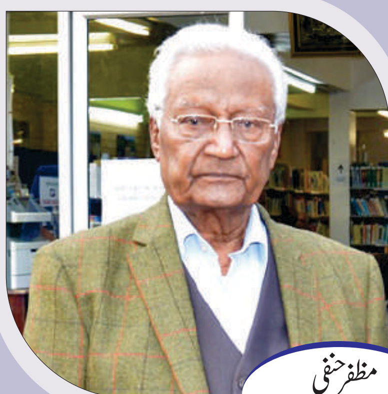

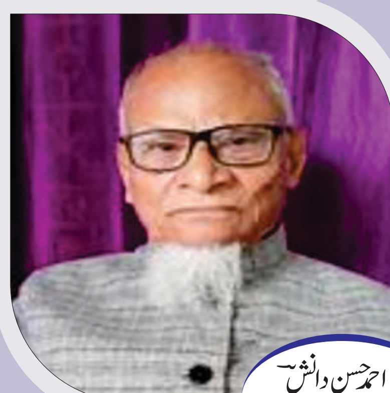

ایڈیٹر، پبلشر **ابرار احمد خان**، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں

طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15